جمادی الأخریٰ۔شعبان المعظّم ۱۴۳۶ھ
اپریل۔جون ۲۰۱۵ء

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

موسس: ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سُورۃ الفاتحہ وسُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
(نواں ایڈیشن) ——— صفحات:360، قیمت475روپے

حصہ دوم سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ
(چھٹا ایڈیشن) ——— صفحات321، قیمت425روپے

حصہ سوم سُورۃ الانعام تا سُورۃ التّوبہ
(پانچواں ایڈیشن) ——— صفحات331، قیمت425روپے

حصہ چہارم سُورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف
(چوتھا ایڈیشن) ——— صفحات394، قیمت475روپے

حصہ پنجم سُورۃُ مَریَم تا سُورۃُ السَّجدۃ
(تیسرا ایڈیشن) ——— صفحات480، قیمت575روپے

حصہ ششم سُورۃُ الاحزاب تا سُورۃُ الحجرات
(دوسرا ایڈیشن) ——— صفحات484، قیمت590روپے

ملنے کے پتے

انجمن خُدّام القرآن خیبر پختونخوا، پشاور
A-18 ناصر مینشن، ریلوے روڈ نمبر2، شعبہ بازار پشاور، فون: (091)2584824,2214495

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

جلد ۳۴ شمارہ ۲

جمادی الاخریٰ۔ شعبان المعظم ۱۴۳۶ھ اپریل۔ جون ۲۰۱۵ء

بیاد:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم ۔ ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مدیر مسئول: ڈاکٹر ابصار احمد

مُدیر: حافظ عاطف وحید

نائب مُدیر:
حافظ خالد محمود خضر

ادارۂ تحریر:
ڈاکٹر حافظ محمد زبیر۔ حافظ نذیر احمد ہاشمی
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

یکے از مطبوعات مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون 3-35869501

ویب سائٹ : www.tanzeem.org

ای میل: publications@tanzeem.org

سالانہ زرِ تعاون: 200 روپے، فی شمارہ: 50 روپے

اِس شمارے میں

حرفِ اوّل

اے بادصبا ایں ہمہ آوردۂ تست ! — حافظ عاطف وحید — 3

تذکّر و تدبّر

ملاكُ التأويل — ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن — 6

فہمُ القرآن

ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی ونحوی تشریح — افادات حافظ احمد یارؒ — 17

حکمتِ نبویؐ

اسلامی برادری کے باہمی تعلقات — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ — 31

فکر و نظر

اسلامی نظریہ حیات (۱) — ڈاکٹر حافظ محمد زبیر — 33

فقہ و اجتہاد

احکامِ شریعہ میں حالات وزمانہ کی رعایت — پروفیسر محمد انس حسان — 41

دعوتِ فکر

اسلام اور مسلمانوں کو درپیش موجودہ چیلنجز؟ (۲) — احمد جاوید — 58

قرآنیات

تفہیم القرآن میں تقابل ادیان — عظمیٰ خاتون فلاحی — 63

نقطۂ نظر

ریاست اور مذہب: اصل بیانیہ — ڈاکٹر خضر یٰسین — 71

افکار و آراء

دینی مدارس میں اصلاحات: تجاویز اور مشورے — محترمہ رضیہ مدنی — 74

اسلام اور سائنس

پانی کی مادی اور روحانی قوتوں کا راز — ڈاکٹر ایم انعام کھوکھر — 77

کتاب نما

تعارف وتبصرہ — ادارہ — 84

بیانُ القرآن

MESSAGE OF THE QURAN — Dr. Israr Ahmad — 96

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست!

حکمتِ قرآن کا یہ شمارہ قدرے تاخیر سے قارئین تک پہنچ پایا۔ 'باعثِ تاخیر' میں مضامین کو مطلوبہ معیار کے مطابق قابلِ اشاعت بنانا اہم ترین ہے۔ نیز مسلم دنیا کے بدلتے اور سنگین تر ہوتے حالات بھی ذہنوں کو منتشر اور اعصاب کو مفلوج کرنے کے لیے کافی ہیں۔ چنانچہ مجلّے کی علمی شناخت برقرار رکھنے کے لیے مضامین کا چناؤ اور اسلوبِ بیان میں اعتدال دشوار ہو جاتا ہے۔

آج کی مسلم دنیا کے لیے 'اُمتِ مسلمہ' کا استعارہ خاصا ناموزوں ہے۔ اُمت تو ہم مقصد اَفراد کے مجموعے کو کہا جاتا ہے۔ جبکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ گوں ناگوں فکری و سیاسی انتشار اور مذہبی و مسلکی افتراق روز افزوں ہے۔ چنانچہ فکری نقب زن بھی موقع کی تلاش میں رہتے ہیں اور سیاسی طالع آزما بھی... کہ کہاں واردات کا ماحول پیدا ہو کہ فوراً ہاتھ صاف کیے جائیں... یا کم سے کم بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لیے جائیں۔ آرمی پبلک سکول پشاور میں ہونے والے سانحے کے معاً بعد ایک طرف ultra secular طبقات کی جانب سے دین بیزاری کا ہذیان ایک طوفان کی صورت اختیار کرنے لگا تو دوسری طرف اس حادثے کی آڑ میں ایک ''جوابی بیانیے'' نے دین کی من پسند تراش خراش کا موقع غنیمت جانا اور دین و مذہب کو ریاستی امور سے بے دخل کرنے کی سعی نامسعود کی گئی۔ وہ تو خیر ہوئی کہ پاکستان کے تمام سنجیدہ دینی طبقات کو اس فتنہ کی سنگینی کا فوری اندازہ ہو گیا اور بلا استثناء ہر سوچنے سمجھنے والے مفرد و جمع نے اس فتنہ کا سخت نوٹس لیا۔ چنانچہ اس فتنہ کو پسپائی اختیار کرنا پڑی... یہ عذرِ لنگ تراش کر کہ اصل میں ہماری بات سمجھی ہی نہیں گئی... ہمارا مقصد یہ تھا ہی نہیں... اصل بات کی تہہ تک لوگ پہنچے ہی نہیں' وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے خیال میں اصل بات یہ ہوئی ہے کہ بظاہر سازگار ماحول دیکھتے ہوئے ''جوابی بیانیے'' کے عنوان سے ضربِ کاری لگائی گئی' لیکن اس کے ایسے ردِّعمل کا اندازہ ہی نہ تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمیں بھی پورا اندازہ نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی حفاظت کیسے فرماتا ہے۔ اس واقعے نے یہ راز بھی کھول دیا۔ فسبحان اللّٰہ و بحمدہٖ سُبحان اللّٰہ العظیم۔

حکمتِ قرآن کے شمارے بابت جولائی تا ستمبر ۲۰۱۴ میں ہم نے ''اُمتِ مسلمہ پر استعمار اور صہیونیت کا مشترک حملہ'' کے عنوان سے اداریہ تحریر کیا تھا' جس میں چند تاریخی شواہد اور حالیہ بین الاقوامی منظرنامے کی بنیاد پر مشرقِ وسطیٰ میں جاری حالیہ یورش کا تجزیہ کیا گیا تھا۔ اس تجزیہ کے نتائج بعینہٖ ایک حقیقت کا روپ دھارے اب ہمارے سامنے ہیں۔ عراق و شام کے بعد اب یمن میں وہی کھیل دہرایا جا رہا ہے۔ استعماری طاقتوں کی کوشش یہ نظر آتی ہے کہ ایک علاقے میں کھیلے جانے والے خونی کھیل کو وہاں کا ''مقامی'' معاملہ بنا کر پیش کیا جائے تاکہ بقیہ مسلم ورلڈ اس سے وقتی طور پر کنارہ کش رہے اور یوں آسانی سے مطلوبہ نتائج حاصل کیے جا سکیں اور پھر نتائج کے حصول بعد ''next!'' کی بربادی کے لیے سٹیج تیار کیا جا سکے۔ آج وہ کل ہماری باری ہے۔ اس تمام روئیداد میں

سب سے المناک حقیقت یہ ہے کہ دشمن کی دشمنی تو عیاں ہے... عدو عدوات نہ کرے تو اور کیا کرے! البتہ مسلمانوں کی صفوں کا داخلی انتشار کس کے سر تھوپا جائے؟ ہمارے خیال میں اس داخلی کمزوری کا الزام سوائے اپنے سر لینے کے اور کچھ ممکن نہیں... میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں۔ تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے۔ اگر حقیقت ایسی نہیں تو قرآن کی یہ آیت کہاں لے جائیں کہ ''اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ!''

یمن اور سعودی عرب کے تنازعے کے بارے میں مرزا ایوب بیگ صاحب کے مندرجہ ذیل تجزیہ سے ہمیں اتفاق ہے جو میثاق کے مئی ۲۰۱۵ء کے شمارہ میں چھپا ہے۔ مرزا صاحب قلمطراز ہیں:

''اب آیئے اس طرف کہ یمن تنازع میں پاکستان کا رول کیا ہونا چاہیے تھا یا اُس کی پالیسی کیا ہونی چاہیے تھی۔ آیئے ہر زاویہ اور سمت سے اس کا جائزہ لیں۔ مسلمان گروہوں کے مابین لڑائی جھگڑے پر ہمارا دین ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ پہلے اُن دونوں میں صلح کی کوشش کرو۔ لیکن اگر صلح نہ ہو سکے تو یہ فیصلہ کرو کہ ان میں سے حق پر کون ہے' جو فریق حق پر ہو اُس کے ساتھ مل کر دوسرے فریق کے ساتھ جنگ کرو۔ سیدھی سی بات ہے کہ یمن میں عبدالرب منصور کی قانونی حکومت موجود تھی' حوثیوں نے اس حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کی اور اس بغاوت میں ایران نے اُن کی بھرپور معاونت کی اور ملک میں انارکی اور فساد پھیل گیا۔ اب وہاں کسی کی بھی حکومت نہیں۔ گویا حوثیوں نے فساد فی الارض کا معاملہ کیا ہے۔ ایران مذاکرات کا شور وغوغا کرتا ہے لیکن حوثیوں کو میز پر لانے کو تیار نہیں۔ سعودی عرب کا مطالبہ ہے کہ سابقہ قانونی حکومت بحال کی جائے اور بعد ازاں منصفانہ انتخابات منعقد کرائے جائیں' اگر حوثی انتخابات جیتیں تو حکومت اُن کے حوالہ کر دی جائے' ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ بات بڑی معقول ہے' لیکن ایران حوثیوں کو مذاکرات کی میز پر لانے کی کوئی کوشش نہیں کر رہا۔ دنیوی سطح پر بھی دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ سعودی عرب نے گزشتہ ۶۸ سال میں کئی مرتبہ ہماری زبردست مدد کی جس کی تفصیل بہت طویل ہے۔ پھر یہ کہ عرب اور خلیجی ریاستوں میں پچیس لاکھ سے زائد پاکستانی ہماری زرمبادلہ کی ضرورت کا بہت بڑا حصہ پورا کر رہے ہیں' یعنی ہماری معیشت کے ٹوٹے پھوٹے ڈھانچے کے لیے یہ سب سے بڑا سہارا ہے۔ اگرچہ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ ہمارے لیے حرمین شریفین مقدس ہیں اور مکہ مدینہ کی حفاظت ہمیں اپنی جان' مال عزت حتیٰ کہ پاکستان کی حفاظت سے بھی کہیں زیادہ اہم ہونا چاہیے' لیکن سعودی خاندان کو قطعی طور پر تقدس حاصل نہیں۔ تاہم اس حوالہ سے چند باتوں پر غور کیا جانا چاہیے:

اگر کوئی بدطینت حرمین شریفین کی بے حرمتی کا قصد کرے گا تو پہلا کام یہ کرے گا کہ اُس کے محافظوں کے خلاف جنگ کرے گا۔

موجودہ سعودی حکمران جیسے کیسے بھی ہیں' کیا یہ حقیقت نہیں کہ حرمین شریفین کی خدمت کا جو معیار اس خاندان نے قائم کیا ہے اس معاملہ میں کسی دوسرے کا اُن پر سبقت لے جانا ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہے۔

یہ کہنا غلط ہے کہ سعودی عرب کی سالمیت کو سرے سے کوئی خطرہ نہیں۔ ایران جس طرح کا اور جتنا اسلحہ یمن پہنچا رہا ہے وہ آج نہیں تو کل سعودی عرب کی سالمیت کے لیے خطرے کا باعث بنے گا۔

کیا اس حقیقت سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ استعماری قوتیں خصوصاً شیطان کے ایجنٹ یہودی حرمین شریفین کے بارے میں کتنے خوف ناک عزائم رکھتے ہیں اور وہ اسی طرح کے کسی فساد فی الارض سے فائدہ اٹھاتے

ہوئے حرمین شریفین کے تقدس کو پامال کرنے کی کوشش کریں گے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ یمن تنازع کے پس منظر میں حرمین شریفین کی سکیورٹی کا معاملہ بلا جواز اٹھا دیا گیا' صریحاً غلط ہے۔ البتہ وہ عرب جسے سعودی عرب کہا جاتا ہے' وہاں اندرونی طور پر کوئی فساد برپا کیے بغیر پُرامن ذرائع سے موجودہ حکومت تبدیل ہوتی ہے اور حرمین شریفین کی خدمت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا تو ہمارے لیے حکومت مقدس ہرگز نہیں۔ قصہ مختصر' نواز شریف حکومت دینی اور دنیوی بنیادوں پر یمن تنازع میں پاکستان کا رول متعین کرے۔ ہماری رائے میں فریقین میں صلح وصفائی کی کوشش کے بعد سعودی عرب کے ساتھ تعاون ناگزیر ہے' کیونکہ ایران کی نسبت عرب کا موقف ہمیں زیادہ مبنی برحق دکھائی دیتا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ عالمِ اسلام غیروں کی سازشوں کو سمجھنے کی کوشش کرے اور متحد ہو کر اسلام دشمن قوتوں کا مقابلہ کرے اور امتِ مسلمہ ایک حقیقت بن سکے' ایک ایسا جسد بن سکے جس کے ایک حصہ کی تکلیف دوسرے حصے کو بے چین اور بے تاب کر دے۔ آمین یاربّ العالمین!''

علومِ قرآنی کے طالبین کے لیے خوشخبری ہے کہ علامہ ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی کی شہرۂ آفاق تالیف ''ملاک التاویل'' کے اردو ترجمہ کا آغاز ہو چکا ہے۔ جناب ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن سے قارئینِ حکمتِ قرآن بخوبی واقف ہیں۔ آپ کے علم وفضل کا شہرہ اور اعتراف شرق وغرب میں ہے۔ علامہ ابن الزبیر کی اس نادر کتاب کے ترجمہ وتلخیص کے لیے جناب ڈاکٹر صہیب حسن سے بہتر کون ہوگا؟ ''فھو احق بھا واھلھا''۔ زیرِنظر شمارے میں ''ملاک التاویل'' کے ترجمے کی پہلی قسط نذرِ قارئین ہے' جو تمہیدی کلمات اور سورۃ الفاتحہ کے تفسیری نکات پر مشتمل ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ اپنے خصوصی فضل وعنایت سے ڈاکٹر صاحب کو اس عظیم علمی خدمت کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے اور اسے ان کے حق میں صدقہ جاریہ بنا دے۔ آمین!

ماہِ گزشتہ کی چودہ تاریخ کو صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن' وبانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کو ہم سے جدا ہوئے پانچ برس بیت گئے۔ ان پانچ برسوں میں زوالِ انسانیت اور اضمحلالِ دین کہاں سے کہاں جا پہنچا' ہمارا تأثر ہے کہ مسلمانانِ پاکستان کی سطح پر بالخصوص اور مسلم اُمّہ کی سطح پر بالعموم ڈاکٹر صاحبؒ کے جانے سے جو یتیمی کی کیفیت طاری ہوئی اسے تاحال کوئی دور نہیں کر سکا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سروں سے شجر سایہ دار اُٹھ گیا اور اب دینی طبقات کا کوئی پُرسانِ حال نہیں! کہیں علم ہے تو فکر غائب' اور کسی کے پاس فکر ہے تو علمِ دین سے محروم... چنانچہ فکر بھی خام اور علم بھی بے اثر! کہیں دونوں کا امتزاج ہے تو اخلاقی اعتبار سے کھوکھلا پن۔ چنانچہ حق کی پکار اور للکارِ اوّل تو ہے ہی مفقود' اور اگر کہیں ہے تو نہایت پُھس پُھسی اور کمزور! مسلمان سرمایہ داروں نے سب سے خطرناک خدمت یہ سرانجام دی ہے کہ معروف رجالِ دین اور دینی قیادت کو 'ایزی لوڈ' کے ایک ایسے نظامِ کفالت میں جکڑ لیا ہے کہ نہ اس طبقے کو کسبِ حلال کی محنت کی ضرورت ہے اور نہ ہی غیرت وخودداری جیسی ''غیر روایتی'' صفات کی اہمیت باقی رہی ہے۔ جب غیرت وخودداری ہی نہ رہی تو کردار کی بلندی کہاں سے آئے گی... اور کردار کھوکھلا ہو جائے تو ''حق'' کی تعبیر وتاویل بھی موقع اور محل کے مطابق ہی ہوگی! شاید یہی وجہ ہے کہ اتنی مدت کے بعد بھی ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کا خلا پُر ہوتا نظر نہیں آتا۔ اللّٰھم اغفر لہٗ وارحمہٗ وعافہ واعفُ عنہ وادخلہ فی رحمتك وحاسبہ حسابًا یسیرًا! آمین یا ربَّ العالمین!!

❁❁❁

مَلاكُ التأوِيل

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی
تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

تمہید

قرآن مجید کی خدمت مختلف انداز میں کی گئی ہے۔ قراءت، تجوید، تفسیر، ربطِ آیات کی شکل میں علومِ قرآن کا ایک وسیع باب قُرّاء اور علماء کی توجہ کا مرکز بنا رہا ہے۔ بعض اہل علم نے اس پہلو کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک ہی آیت کتاب اللہ میں دو مرتبہ یا کئی مرتبہ بیان ہوئی ہے، لیکن یا تو ان آیات میں ایک دو حرف یا الفاظ کی بنا پر اختلاف واقع ہوا ہے یا آیت کے الفاظ تو وہی ہیں لیکن سیاق وسباق کے اختلاف کی بنا پر ہر جگہ نئے معانی ومطالب اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے بہتر اور جامع کتاب ''مَلاكُ التأويل'' ہے جس کے مصنف اُندلس کے ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی ہیں جن کا سن وفات ۷۰۸ھ ہے۔ کتاب کا پورا نام ہے:

ملاك التأويل القاطع بذوى الالحاد والتعطيل فى توجيهه المتشابه اللفظ من آى التنزيل

صاحبِ کتاب مقدمۃ الکتاب میں لکھتے ہیں:

''میں جس فن کے بارے میں لکھنا چاہتا ہوں، وہ تغافلِ زمانہ کا شکار رہا ہے۔ مراد اس فن سے یہ ہے کہ اگر ایک آیت قرآن میں تکرار کے ساتھ بیان ہوئی ہو، یا آیت کے الفاظ میں تقدیم وتاخیر ہو یا کوئی کلمہ زائد ہو تو اس کی وجہ سے معانی ومطالب میں کیا فرق واقع ہوتا ہے۔

اس فن میں بہت کم لکھا گیا ہے، حالانکہ ملحد اور کم فہم لوگ اس بنا پر اعتراضات کرتے نظر آتے ہیں۔ مجھے علمائے شرق میں سے ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ الخطیب الاسکافی (وفات: ۴۲۰ھ) کی کتاب ''درّةُ التنزيل وغُرّة التأويل'' ہاتھ لگی جس میں اس فن کی باریکیوں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں نے جو کچھ اپنی کتاب میں لکھا ہے وہ اپنے فہم اور تدبّر کی بنا پر لکھا ہے اور پھر اس کا الاسکافی کی کتاب سے موازنہ کیا ہے۔ وہ کئی مقامات کو چھوڑتے گئے ہیں، جنہیں میں نے پُر کیا ہے یا ان کی تحریر میں اضافہ کیا ہے۔ ایسے مقامات پر میں نے حرف ''غ'' درج کر کے تنبیہ کر دی ہے۔ (غ سے مراد یہ ہے کہ اِسکافی اس مقام سے غافل رہے ہیں) اور اس لحاظ سے میں یہ دعویٰ کرنے میں حق بہ جانب ہوں کہ اس موضوع پر یہ کتاب اس فن کی ایک بے نظیر کتاب ہے۔

صاحبِ ملاک التاویل کے سوانح حیات

اب صاحبِ کتاب کی سوانح کا مختصر بیان ہو جائے:

ابن الزبیر کی ولادت کا سال ۶۲۷ھ ہے۔ اندلس کے شہر جیان میں پیدا ہوئے۔ ۶۴۳ھ میں جب کہ ان کی عمر سولہ سال تھی، ان کے والد اس شہر پر دشمن کے قبضے کی بنا پر ''مالقہ'' ہجرت کر گئے، جہاں ابن الزبیر نے علمائے وقت کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ تحصیل علم کے بعد انہوں نے درس و تدریس کا آغاز کیا، جس میں کتاب اللہ کو قراءت کے ساتھ پڑھانا، حدیث کو سننا اور سنانا، عربی زبان کا پڑھانا اور فقہ کی تعلیم شامل تھی۔ حدیث میں خصوصی مہارت کی بنا پر محدثِ اندلس کہلائے۔ ان کے شاگرد ابوحیان اندلسی اپنی کتاب ''النضّار'' میں لکھتے ہیں:

> ''ابن الزبیر تھے ایک جلیل القدر محدث، نقاد، نحوی، ماہر اصول فقہ، خطاط، معلم قراءتِ قرآن، مفسّر اور مؤرخ۔ نہ صرف مالقہ بلکہ غرناطہ اور دوسرے شہروں میں قرآن، حدیث اور نحو کی تعلیم دیتے رہے۔ فن قراءت کا خاص خیال رکھتے۔ جس وقت مالقہ چھوڑا ہے، ان کے چار طلبہ نحو کے استاذ سیبویہ کی کتاب پڑھ رہے تھے۔''

ابن الخطیب نے ان کی زندگی کے ایک دوسرے پہلو کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

> ''خشوع اور خشیت کا ان پر غلبہ تھا، زبان میں روانی تھی، حق کہنے میں بے باک تھے، اہلِ بدعت کے لیے ننگی تلوار تھے، سنت کے شیدائی تھے، عوام و خواص میں قدر و منزلت کے حامل تھے، مجلسی زندگی میں ظرافت اور نُدرت کا عنوان تھے، اور اس ضمن میں ان سے بہت سی حکایات منسوب ہیں جن میں وقار اور متانت ملحوظِ خاطر ہیں۔''

حق بات کہنا ان کے لیے آزمائش کا سبب بن گیا۔ مالقہ میں ابراہیم نامی ایک شخص عجیب و غریب عادات کا مالک تھا، خارقِ عادت اعمال کا دعویٰ کرتا تھا، مستقبل کی باتیں لوگوں کو بتا کر اپنی کرامت کا سکّہ جمانے کی کوشش کرتا تھا۔ مالقہ میں اس وقت بنی اشقیلولہ کا ایک شخص، زبردستی امارت پر قابض ہو چکا تھا۔ ابن الزبیر نے جب اس کے فریب اور دجل کو آشکار کرنا شروع کیا تو اس نے امیر مالقہ سے شکایت کی۔ ابن الزبیر نے مالقہ سے چلے جانے میں عافیت سمجھی، ان کے جاتے ہی ان کی رہائش گاہ کو لوٹ لیا گیا، ان کی بیش قیمت کتابیں، شیوخ سے اخذ کردہ قیمتی نکات پر مشتمل تحریریں، سب کی سب ضائع ہو گئیں۔ ابن الزبیر نے غرناطہ کے امیر ابوعبداللہ بن الأمیر الغالب باللہ بن نصر کے ہاں پناہ لی جس نے انہیں قدر و منزلت کے ساتھ اپنے دربار میں جگہ دی۔

یہی وہ زمانہ ہے جب ابن الزبیر نے اپنی یہ کتاب تصنیف کی اور اسے مذکورہ امیر المسلمین بن امیر المسلمین کی طرف منسوب کیا، لیکن حالات کے بدلنے میں دیر نہ لگی اور ان کے ایک پڑوسی کی چغلی کی بنا پر وہ نشانۂ عتاب بنے، انہیں اپنے ہی گھر میں محبوس کر دیا گیا، ایک طویل عرصہ کے بعد گھر کی قید سے چھٹکارا ملا، اور اس عرصہ میں مالقہ کی امارت امیر ابی عبداللہ بن نصر کے ہاتھ آ گئی اور ابن الزبیر کو دوبارہ انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ اب یہ موقع تھا کہ ابن زبیر مالقہ کے دجال ابراہیم النفراری کا پردہ چاک کریں۔ امیر کی ہدایت پر اہالیان شہر میں سے چند لوگوں کے مطالبہ پر اسے گرفتار کر لیا گیا، اس کے عقائد اور شعبدہ بازیوں کی چھان بین کی گئی اور پھر سزائے موت سنائی گئی۔ جب حد نافذ کرنے کا وقت آیا اور اس پر تلوار کا وار کیا گیا تو تلوار نے کام نہیں کیا۔ ابن الزبیر نے کہا کہ اس کے کپڑے اُتارے جائیں، دیکھا گیا کہ اس کے بدن پر تعویذات قسم کی تحریر مکتوب ہے۔ چنانچہ یہ

سب کچھ دھو دیا گیا' اس کی زبان کے نیچے ایک ننھی سی کنکری پائی گئی جو نکال دی گئی' اور پھر تلوار اپنا کام کر گئی۔

ان کے ایک مشہور شاگرد ابوحیان نحوی (مصنف کتاب البَحر المُحِیط) ان کی شان کے بارے میں یوں رطب اللسان ہیں:

''ابن الزبیر نہ صرف اندلس کے بلکہ سارے مغرب کے محدث تھے' نیک نام اور مخیّر تھے' عوام وخواص میں مقبول تھے' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عامل تھے' کسی کے در پر ہاتھ پھیلانے والوں میں سے نہ تھے اور اسی وجہ سے شاہوں اور امراء کے معتوب رہے' حق کہنے کی پاداش میں تنگی دیکھی اور محبوس بھی رہے' لیکن صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ بہت عرصہ غرناطہ کی جامع مسجد کے امام وخطیب رہے' فتویٰ نویسی سے بھی اشتغال رہا' نکاح خوان بھی تھے' درس وتدریس کا طویل سلسلہ رہا اور ان کے بے شمار شاگردوں کی بنا پر ان کا علم اگلی نسلوں میں منتقل ہوتا رہا۔''

ابن الزبیر کے شیوخ کی تعداد چار سو تک پہنچتی ہے' تلامذہ کی تعداد اس سے زیادہ ہے جن میں ابوحیان نحوی' ابن الزیات اور ابن الحاج جیسے فضلاء نظر آتے ہیں۔

تصنیفات کی تعداد بارہ کے قریب ہے جس میں ''البرهان في ترتيب سُور القرآن'' اور ''ملاك التأويل'' سرفہرست ہیں۔ مذکورہ کتاب مصر کے ڈاکٹر محمود کامل احمد کی تحقیق کے ساتھ دو جلدوں میں ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی ہے۔

ان تمہیدی کلمات کے بعد ہم اصل کتاب کی تلخیص اور ترجمانی کا بیڑا اٹھاتے ہیں' اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ ہمیں اس کارِ عظیم کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

صہیب بن عبدالغفار حسن
نزیل لندن۔ برطانیہ

سورۃ اُمّ القرآن (الفاتحہ)

پہلی آیت (غ): اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○

سورۂ فاتحہ اُمّ القرآن ہے۔ ترتیب مصحف کے اعتبار سے پہلی سورت ہے۔ تمام امور کے آغاز واختتام پر اللہ تعالیٰ کی حمد (تعریف وتوصیف) ایک ثابت شدہ امر ہے۔ خود کتاب اللہ میں کئی سورتوں کے آغاز واختتام پر حمد کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو ہدایت دی: ﴿وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ (الاسراء: ۱۱۱)

قرآن میں اکثر جگہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' ہی وارد ہے' لیکن سورۃ الجاثیہ (آیت ۳۶) میں ''فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ'' کہا گیا اور ہر جگہ ان الفاظ کے بعد اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات کو بیان کیا گیا۔

یہاں ایک سائل چار سوال کر سکتا ہے۔

پہلا سوال: سورۃ الفاتحہ اور دوسری کئی سورتوں میں وارد ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' اور سورۃ الجاثیہ میں وارد ''فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ'' میں کیا فرق ہے؟

دوسرا سوال: ان پانچ سورتوں: الفاتحہ‘ الانعام‘ الکہف‘ سبا‘ فاطر کا آغاز ’’اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ‘‘ سے ہوا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے جبکہ ان میں سے ہر ایک سورت اپنے مضمون کے اعتبار سے اپنا امتیازی وجود رکھتی ہے۔

تیسرا سوال: ان سورتوں میں ’’اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ‘‘ کے بعد ہر سورت میں اللہ تعالیٰ کے مختلف اوصاف بیان ہوئے ہیں‘ جیسے:

سورۃ الفاتحہ میں: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝﴾

سورۃ الانعام میں: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ؕ﴾

سورۃ الکہف میں: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ﴾

سورۃ سبا میں: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾

سورۃ فاطر میں: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾

تو کیا ان اوصافِ باری تعالیٰ کی ہر سورت کے ساتھ خاص مناسبت ہے جو دوسری سورت میں پائی نہیں جاتی؟

چوتھا سوال: کیا وجہ ہے کہ جس طرح مذکورہ سورتوں میں ’’اَلْحَمْدُ‘‘ سے ابتدا کرتے ہی ہر سورت میں مختلف صفاتِ باری تعالیٰ بیان ہوئیں‘ لیکن جہاں جہاں سورت کے اختتام میں یہ آیت آئی ہے وہاں ایک ہی اسلوب کے ساتھ سورت کا اختتام ہو رہا ہے؟ جیسے:

سورۃ الانعام میں کہا گیا: ﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝۴۵﴾

سورۂ یونس میں ارشاد ہوا: ﴿وَاٰخِرُ دَعْوٰىہُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝۱۰﴾

سورۃ الزمر میں کہا گیا: ﴿وَقُضِیَ بَیْنَہُمْ بِالْحَقِّ وَقِیْلَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝۷۵﴾

اور سورۃ الصافات کا یوں اختتام ہوا: ﴿وَسَلٰمٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ۝۱۸۱ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝۱۸۲﴾

پہلے سوال کا جواب

پہلے سوال میں جواباً عرض ہے کہ:

’’اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ‘‘ عربی نحو کے اعتبار سے مبتدأ اور خبر ہے۔

’’وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ‘‘ میں خبر کو پہلے ذکر کیا گیا اور مبتدأ کو بعد میں اور عربی مسلمہ قواعد کے اعتبار سے مبتدأ کو پہلے ذکر کیا جانا چاہیے اِلا یہ کہ اسے مؤخر کرنے اور خبر کو مقدم کرنے کا خاص کوئی سبب ہو۔

سورۃ الجاثیہ میں خبر کو مقدم رکھا گیا ہے اور ہم یہاں یاد دلاتے چلے جائیں کہ تقدیم و تاخیر کا تعلق صرف لفظی ترکیب کے ساتھ ہی نہیں بلکہ معانی و مطالب کے ساتھ بھی ہے۔

’’وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ‘‘ گویا ایک سوال کا جواب ہے اور وہ اس طرح کے پہلے اللہ کو جھٹلانے والوں کا انجام بتایا گیا ہے۔ انبیاء و رسلؑ نے جیسے جیسے مکذبین کو خبردار کیا تھا‘ اس کے مطابق واقعات کو انجام پذیر ہوتا دکھائی دیا گیا ہے اور پھر یہ سوال اٹھایا گیا: اب بتاؤ کہ حمد کا مستحق کون ہے؟

اور اس سلسلے کی دوسری آیت ہے: ﴿لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ؟﴾ ’’آج بادشاہت کس کی ہے؟‘‘ پھر خود ہی

جواب دیا: ﴿لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ⑯﴾ (غافر) ''اللہ کے لیے جو واحد ہے قہر والا ہے۔''

اب ذرا ملاحظہ فرمائیں کہ دونوں مقامات کتنے مشابہ ہیں:

سورۂ غافر (یا سورۃ المؤمن) میں پہلے ارشاد ہوا:

﴿لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ⑮ يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ۚ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ۭ﴾

''تاکہ وہ ملاقات کے دن سے خبردار کردے' وہ دن جبکہ سب لوگ بے پردہ ہوں گے' اللہ سے ان کی کوئی بات بھی چھپی ہوئی نہ ہوگی۔''

یعنی اب جبکہ ہر چیز ظاہر ہوگئی ہے اور جو بات پہلے خبر تھی اب مشاہدے میں آ گئی ہے تو پھر یہ سوال اٹھایا گیا:

﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ؟﴾ ''آج بادشاہت کس کی ہے؟''

سورۃ الجاثیہ میں پہلے یہ الفاظ آئے:

﴿وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا﴾ (آیت ۳۳)

''اور ان کے اعمال کی برائیاں ان پر ظاہر ہوگئیں۔''

یہ دن وہی ملاقات کا دن ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی۔ اب جبکہ تمام حقیقت ظاہر ہو چکی' شکوک اور شبہات کے بادل چھٹ گئے تو گویا ان سے سوال ہوا: اب بتاؤ کہ تمام تعریفوں کا مستحق کون ہے؟ اور قدرتی طور پر جواب دیا گیا: ''فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ'' اللہ ہی کے لیے سب تعریفیں ہیں۔

اور خیال رہے کہ جواب کی روشنی میں سوال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے چاہے اس کا ذکر نہ کیا گیا ہو' یعنی وہ سوال جس کا ہم یہاں مفروضہ اختیار کر رہے ہیں' وہ اتنا واضح ہے کہ وہ ایسے ہی ہے جیسے وہ سوال جس کا ذکر کر دیا گیا ہو۔ اور ایسا اختصارِ کلام کی بنا پر کیا جاتا ہے۔

اب دیکھئے کہ سورۃ المؤمن میں مُلك (بادشاہی) کا ذکر سوال میں موجود تھا: ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ﴾ تو جواب میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ صرف کہا: ﴿لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ○﴾۔ یہ نہیں کہا: فَلِلّٰهِ الْمُلْك ''بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے۔

دوسری طرف سورۃ الجاثیہ میں ''الْحَمْدُ'' کا ذکر پہلے نہیں کیا گیا تھا' صرف سیاق وسباق کی بنا پر اس کا اندازہ کیا گیا تھا اس لیے جواباً اس کا ذکر صراحتاً کیا گیا اور کہا گیا: فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ۔

اس سورت میں مقصود تھا کہ مکذّبین کو ڈانٹا جائے' ان کی سرزنش کی جائے اور اب جبکہ ان کے اپنے دعووں اور تعلّیوں کی قلعی کھل گئی تھی تو پھر نہ صرف یہ کہا گیا کہ اللہ ہی کے لیے سب تعریفیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و ربوبیت کا بھی کھل کر اعلان کیا گیا کہ:

﴿رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ㊱﴾ (الجاثیۃ)

''جو رب ہے آسمانوں کا' رب ہے زمین کا اور رب ہے تمام جہانوں کا۔''

آسمان اور زمین چونکہ اللہ کی بڑی نشانیوں میں سے ہیں' اس لیے ان کا خاص طور پر ذکر کیا۔ سورۂ غافر میں ارشاد ہوا:

﴿لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ﴾ (غافر:۵۷)

''آسمان اور زمین کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے سے زیادہ بڑی بات ہے۔''

چنانچہ سورۃ الجاثیہ میں پہلے اپنی ان دو بڑی نشانیوں کا ذکر کیا اور اس کے بعد رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہہ کر اپنی عمومی ربوبیت کا ذکر کیا۔

''العالم'' سے مراد اللہ کے سوا باقی ساری اس کی مخلوقات ہیں' پھر کہا:

﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ﴾ (الجاثیۃ:۳۷)

''اور اسی کے لیے بڑائی ہے آسمانوں میں اور زمین میں۔''

یعنی عظمت' جلال' تخلیق' تدبر سب کا مالک تنہا وہی ہے' وہ عزت والا ہے کہ سب اس کے سامنے سرنگوں ہیں۔ وہ اپنے تمام افعال میں حکمت والا ہے گو ہماری عقلیں اس کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ پاتیں اور نہ انسانی فکر اس کے افعال کا احاطہ کر سکتی ہے۔ اور چونکہ یہاں مشرکین اور اللہ کے ساتھ غیروں کی پرستش کرنے والوں کی سرزنش مقصود تھی اس لیے اس آیت میں مذکورہ اوصافِ باری تعالیٰ کا طوالت کے ساتھ ذکر کیا گیا' لفظ ربّ کا بار بار اعادہ کیا گیا' برخلاف سورۃ الفاتحہ کے' جہاں مؤمنوں سے خطاب ہے۔ جو لوگ اللہ کو مانتے ہیں ان کی تعلیم مقصود ہے' اس لیے اختصار سے کام لیا گیا اور سورۃ الجاثیہ کی طرح طوالت سے کام نہیں لیا گیا' یعنی دونوں سورتوں میں اسلوبِ بیان کا اختلاف اس سورت کے مضمون کے اعتبار سے ہے۔

دوسرے سوال کا جواب

دوسرے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ ان پانچ سورتوں کی ابتدا ''اَلْحَمْدُ'' سے کی گئی ہے۔

سورۃ الفاتحہ اُمّ القرآن ہے' قرآن کی پہلی سورت ہے' مطلع قرآن ہے' اس لیے اس کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ کی تعریف کا ہونا بالکل واضح ہے۔

سورۃ الانعام میں ثنویہ (دو خداؤں کے قائل) کے مذہب کا ابطال ہے اور ان تمام لوگوں کا جو نور اور ظلمت کے قائل ہیں یا کائنات میں دو فاعلوں کی کارکردگی کو مانتے ہیں۔ میں نے اپنی کتاب ''البرہان'' میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے اور چونکہ اس موضوع کا خاص طور پر اس سورت ہی میں ذکر آیا ہے' اس لیے اس سورت کا آغاز اللہ تعالیٰ کی تعریف سے ہونا قدرتی تھا۔ اس کی مزید وضاحت اگلے سوال کے جواب میں آ رہی ہے۔

سورۃ الکہف میں ایک تو غار والوں کا قصہ ہے' یہودیوں کے ذوالقرنین کے بارے میں سوال کا جواب ہے جو انہوں نے کفارِ قریش کی زبانی ارسال کیا تھا۔ یہ دونوں باتیں کسی اور سورت میں بیان نہیں ہوئیں' اس لیے اس سورت کا آغاز اللہ تعالیٰ کی حمد سے کرنا مناسب تھا۔

سورۂ سبا وہ واحد سورت ہے جس میں قومِ سبا کا تفصیلی قصہ بیان ہوا ہے' ماسوا ایک اشارے کے جو سورۃ النمل میں ذکر ہوا ہے' جہاں ہُدہُد کی زبانی یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴿۲۲﴾﴾ ''اور میں سبا سے ایک یقینی خبر لے کر آیا ہوں''۔ اور اس سورت میں اس قصے کے علاوہ داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو جو خصوصیات دی گئی تھیں ان کا خاص طور پر ذکر ہوا ہے جیسے ان کے لیے پہاڑوں کا مسخر کیا جانا' پرندوں کی زبان کا

سمجھنا' جنات کی تسخیر اور لوہے کا پگھلایا جانا' یہ سب باتیں کسی اور سورت میں بیان نہیں ہوئیں' اس لیے اس سورت کی ابتدا احمد باری تعالیٰ سے ہوئی کہ وہ آسمان اور زمین کی بادشاہت کا حامل ہے اور وہی دنیا اور آخرت میں قابلِ ستائش ہے۔

سورۂ فاطر میں فرشتوں کی پیدائش' ان کے بے شمار پر ہونے اور پیغامبر ہونے کا خصوصی تذکرہ ہے' آسمان و زمین کی خلقت' انہیں تھامے رکھنے اور زائل ہونے سے بچانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ باتیں کسی اور سورت میں بیان نہیں ہوئیں اس لیے اس سورت کا بھی حمدِ باری تعالیٰ سے شروع کیا جانا مناسب ہوا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ جہاں کہیں کسی سورت میں صرف ایک ہی مضمون بیان ہوا ہو وہاں حمد باری تعالیٰ کا ہونا ضروری ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسا ہونا جائز ہے' لیکن ان پانچ سورتوں کی حمد کے ساتھ انفرادیت بھی واضح ہے۔

تیسرے سوال کا جواب

اُمّ الْقُرآن (الفاتحہ) چونکہ قرآن کی پہلی سورت ہے' آیات میں سب سے پہلی آیات پر مشتمل ہے اور قرآن خود ہر چیز کو واضح طور پر بیان کرنے والا اور اللہ کی وحدانیت کا اعلان کرنے والا ہے اور یہ کہ وہی خالق اور موجد ہے' دونوں دنیاؤں کا مالک ہے اور اس قرآن میں ان دونوں عالَم کے بارے میں ہر چیز کا علم ہے' اس لیے یہ بالکل مناسب تھا کہ اللہ کے ذکر کے بعد اس کے ایسے عالی اوصاف ذکر کیے جاتے جو مندرجہ بالا حقائق کی عکاسی کرتے' یعنی یہ کہ وہی ربّ العالمین ہے' وہی الرحمٰن اور الرحیم ہے' وہی جزا و سزا کے دن کا مالک ہے' اور یہ سب کچھ بتانا اس لیے بھی ضروری تھا کہ کسی مدعی کے لیے کسی دعویٰ کی گنجائش نہ رہے' حقیقت اظہر من الشّمس ہو کر رہ جائے اور خبر صرف خبر نہ رہے بلکہ ایسی ہو جائے جیسے چشم دید ہو۔

سورۃ الانعام میں چونکہ ان لوگوں کی طرف اشارہ آنے والا تھا جو نور اور ظلمت کے خداؤں پر یقین رکھتے ہیں' خیر کو نور سے اور شر کو اندھیرے سے ماخوذ مانتے ہیں' اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس سورت کا آغاز اس تمہید کے ساتھ کیا کہ وہی آسمان اور زمین کا خالق ہے کہ ان دونوں کا تعلق ان بڑے بڑے سیاروں اور ستاروں کے ساتھ ہے جن کا تعلق اندھیرے یا روشنی سے ہے اور پھر ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ ہی نور کا خالق ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے کے ضمن میں ان لوگوں کے مذہب کا رد کیا جو ستاروں کی پوجا کیا کرتے تھے۔ قصے کا آغاز اس آیت سے ہوتا ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (آیت ۷۵)

''اور اس طرح ہم ابراہیم کو آسمان اور زمین کے ملکوت دکھا رہے تھے۔''

پھر کہا:

﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ﴾ (آیت ۷۶)

''اور جب رات ہو گئی تو اس نے ایک ستارہ دیکھا۔''

پھر انہوں نے اپنی قوم پر حجت قائم کرنے کے لیے مفروضے کے طور پر کہا:

﴿هٰذَا رَبِّیۡ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الۡاٰفِلِیۡنَ ﴿۷۶﴾﴾

''یہ میرا رب ہے' اور جب وہ ڈوب گیا تو کہا میں ڈوبنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

یہی بات پھر چاند اور سورج کے بارے میں بھی کہی۔ استدلال یہ تھا کہ ان دونوں کا طلوع ہونا پھر غروب ہونا بتاتا ہے کہ ان میں ہر آن تغیر اور تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے اور یہی بات اس بات کی دلیل ہے کہ یہ تو خود کسی کے ہاتھ میں ہیں' کوئی انہیں مسخر کیے ہوئے ہے' یہ تو اپنے موجد کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں جو کہ خود تغیّر و تبدّل سے پاک ہے۔ اور پھر صاف صاف کہہ دیا:

﴿اِنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِکُوۡنَ ﴿۷۸﴾﴾

''میں تمہارے شرک سے بریٔ الذمّہ ہوں۔''

اور یہ بھی واضح کر دیا کہ اوّل اور آخر وہ کیا تھے۔ سورۂ آل عمران میں فرمایا:

﴿مَا کَانَ اِبۡرٰہِیۡمُ یَہُوۡدِیًّا وَّلَا نَصۡرَانِیًّا وَّلٰکِنۡ کَانَ حَنِیۡفًا مُّسۡلِمًا ؕ وَمَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۶۷﴾﴾

''ابراہیم نہ یہودی تھے نہ نصرانی' بلکہ شرک سے بیزار مسلمان تھے' اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔''

اور ان کے اس قول میں کہ ﴿وَمَاۤ کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ﴾ ستاروں کی عبادت کی بالکل نفی ہو گئی۔

اب تو یہ بالکل واضح ہو جانا چاہیے کہ سورۃ الانعام کا آغاز ان جملوں کے ساتھ کیوں ہوا کہ وہی خالق السماوات والارض ہے اور وہی ظلمات اور نور کا پیدا کرنے والا ہے۔

جہاں تک سورۃ الکہف کا تعلق ہے تو اس میں اصحابِ کہف کا قصہ بیان ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کی ملاقات کا بیان ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں بتایا گیا ہے جو زمین کی طنابیں کاٹنے والا تھا' وہاں تک پہنچا کہ جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے اور وہاں بھی جہاں غروب ہوتا ہے۔ پھر اس نے یأجوج اور مأجوج کا راستہ روکنے کے لیے بند بھی باندھ دیا۔ اور یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ عقل سے معلوم نہیں ہو سکتیں۔ ان کی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے تو صرف وحی سے کہ جس میں نہ ٹیڑھ پن ہے' نہ کجی ہے' نہ شک و شبہ کی گنجائش ہے اور نہ گمراہی کی' اس لیے یہ بالکل مناسب تھا کہ اس سورۃ کا آغاز وحی کے ذکر سے کیا جاتا۔ فرمایا:

﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَلَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا ﴿۱﴾﴾

''تعریف اس اللہ کی جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری اور اس میں کوئی کجی نہیں رکھی۔''

سورۃ الملائکہ (سورۃ فاطر) میں آغاز ہوتا ہے کہ اللہ ہی آسمان و زمین کا بنانے والا ہے' اور وہ اس لیے کہ اس سورت میں آسمان کی اُس مخلوق (فرشتوں) کا ذکر ہے جو آسمانوں کو آباد کیے ہوئے ہیں۔ وہ پر رکھتے ہیں۔ اور پھر اس بات کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کو ایسے تھام رکھا ہے کہ وہ اپنی جگہ سے زائل نہیں ہو سکتے۔ اور ان تمام چیزوں کا ذکر کسی دوسری جگہ اتنا مناسب نہ تھا جتنا اس سورت کے آغاز میں۔ اس وضاحت سے معلوم ہو گیا کہ ان پانچوں سورتوں کا آغاز ان کے سیاق و سباق سے بالکل مناسب تھا۔ واللہ اعلم!

سورۂ سبا میں حضرات داؤد اور سلیمان علیہما السلام کا ذکر ہے اور کیسے ان کے لیے پہاڑوں، پرندوں' ہوا کو مسخّر کر دیا گیا اور کیسے لوہے کو ان کے لیے نرم کر دیا گیا۔ اس لحاظ سے سورت کے آغاز میں یہ کہنا بالکل مناسب تھا کہ ان

میں ہر چیز کا مالک اللہ ہے' وہی ان کا مسخر کرنے والا ہے اور وہی ان میں جیسے چاہے تصرف کرنے والا ہے۔ فرمایا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾ (الانعام:۱)

''تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس کے لیے ہر وہ شے ہے جو آسمانوں میں ہے یا زمین میں ہے۔''

چوتھے سوال کا جواب

سورتوں اور آیات کے اختتام میں وہ باتیں مقصود نہیں جو کہ آغاز میں مطلوب ہوتی ہیں' بلکہ کسی بھی عمل کے خاتمہ پر یا کسی بھی کام کے انجام کے وقت صرف ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ کہنا مشروع قرار دیا گیا ہے اور اس قول میں گویا ایک مؤمن اس بات کا اعتراف کر رہا ہے کہ اللہ ہی خالق ہے' آمر ہے' **مالك الدارین** ہے اور ہر اس وصف کا مستحق ہے جو ان سورتوں میں بیان ہوئے۔ یہاں نہ ڈانٹ ڈپٹ کا موقع ہے اور نہ کسی دھمکی کا' اس لیے صرف ''**الحمد**'' پر اکتفا کیا گیا۔

دوسری آیت :﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۝﴾

یہاں صرف ایک ہی سوال وارد ہوتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ ان دو عالی صفات پر مشتمل آیت کو ان دو آیتوں کے درمیان رکھا گیا جو اللہ تعالیٰ کے مالک ہونے پر دلالت کرتی ہیں' یعنی ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝﴾ اور ﴿مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ۝﴾ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پہلی آیت جس میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی گئی ہے کہ وہی عالمین کا رب ہے اور ہر چیز کا مالک ہے' اس آیت سے متصل ''**مالك یوم الدین**'' ہونا چاہیے تھا' تاکہ دونوں عالم کے مالک ہونے کا ذکر ساتھ ساتھ ہو جاتا اور یہ واضح ہو جاتا کہ اللہ تعالیٰ ہی خالق' آمر اور حاکم ہے۔ جیسے سورۃ القصص میں کہا گیا:

﴿لَهُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰی وَالْاٰخِرَةِ﴾ (آیت ۷۰)

''اُسی کے لیے سب تعریفیں ہیں پہلے (عالم) میں بھی اور آخری میں بھی۔''

اس لحاظ سے آیت یوں ہونی چاہیے تھی:

''**الحمد للّٰه ربِّ العالمین' مالك یوم الدین**''

لیکن کیا درمیان میں ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۝﴾ کے ذکر سے قوتِ بیان میں وہ زور باقی رہا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو خاص عنایت اور تکریم سے نوازا ہے' فرمایا:

﴿كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

''تم وہ بہترین اُمت ہو جو لوگوں (کی ہدایت) کے لیے نکالی گئی ہے''

اور نبی ﷺ کو اولادِ آدمؑ کا سردار اور تمام مخلوقات میں منتخب قرار دیا' اور یہ حقیقت ہے کہ پیروی کرنے والا اپنے مقتدی یا امام کی بنا پر عزت پاتا ہے۔ اب ملاحظہ کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ سے خطاب کیا تو انتہائی محبت اور لطافت سے۔ آپ کو ایک غلطی پر متنبہ کرنا تھا لیکن پہلے معاف کرنے کی بات کی اور پھر وہ الفاظ کہے جن سے عتاب ظاہر ہوتا ہے:

﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ﴾ (التوبۃ:۴۳)

''اللہ نے تمہیں معاف کیا' تم نے انہیں کیوں اجازت دی؟''

اور یہ اس لیے کیا کہ نبی ﷺ کے قلب مبارک کو تکلیف نہ پہنچے۔ بالکل اسی طرح اس نبی کی امت کے ایمان والوں کے ساتھ یہی مشفقانہ خطاب اختیار کیا کہ جس دن ان کے اعمال اللہ کے حضور پیش کیے جائیں گے تو وہ اللہ کو رحمٰن ورحیم پائیں گے۔ اس لیے ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ سے قبل ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کا تذکرہ کر دیا۔ وہ اس لیے کہ یہ دن بڑا سخت دن ہوگا: ﴿اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ﴿۴۲﴾﴾ (ابراھیم) ''انہیں اس دن تک کی مہلت دے گا جب کہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی''۔ اور فرمایا: ﴿وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَاهُمْ بِسُكٰرٰى﴾ (الحج:۲) ''اور ہر حاملہ اپنے حمل کو گرا دے گی اور لوگ تمہیں مدہوش نظر آئیں گے' حالانکہ وہ نشے میں نہ ہوں گے''۔ اور اس طرح حساب وکتاب سے قبل رحمت کا ذکر کر کے اس اُمت سے بھی مشفقانہ خطاب کیا جیسے ان کے نبیؐ سے کیا تھا۔

تیسری آیت : ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ (مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ)

عاصم اور کسائی کی قراءت میں ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ پڑھا گیا اور دوسری قراءت میں (مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ)۔ سورۂ آل عمران آیت ۲۶ میں کہا گیا:

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ﴾

یہاں صرف یہی ایک قراءت ہے۔ سورۃ الناس میں کہا گیا: ﴿مَلِكِ النَّاسِ﴾ یہاں بھی صرف یہی ایک قراءت ہے۔ تینوں آیات میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اللہ ہی بادشاہ ہے اور وہی مالک ہے۔

لیکن قراءت کے اس اختلاف سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ اختلاف کیوں ہے؟ اور جب کہ تینوں آیات کا مقصود ایک ہی ہے تو اُمّ القرآن (الفاتحہ) کی اس آیت میں دونوں قراءت کا ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ حالانکہ یہ بات تو طے ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر شے کے مالک بھی ہیں اور اسے وجود عطا کرنے والے بھی ہیں۔ وہ بادشاہ بھی ہیں اور مالک بھی' اور کیا یہ اختلاف اس لیے ہے کہ تینوں آیات کے مقاصد جدا جدا ہیں؟

جواب یہ ہے کہ تینوں آیات کا حاصل تو یہی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ بادشاہ بھی ہے اور مالک بھی۔ اور یہ بات سورۃ الفاتحہ کی اس آیت میں دونوں قراءت سے ظاہر ہوتی ہے' اور سورۂ آل عمران کی آیت میں ﴿مَالِكَ الْمُلْكِ﴾ کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ وہ بادشاہ بھی ہے کیونکہ مُلْك (بادشاہت) کا تعلق بادشاہ ہی سے ہوتا ہے اور اس طرح دونوں صفات (یعنی مَلِك اور مَالِك) ثابت ہو گئیں۔ اور سورۃ الناس میں ''رَبِّ النَّاس'' کہہ کر ''مَالِكِ النَّاسِ'' کہنے کی حاجت نہیں رہی' کیونکہ رب ہی مالک ہوتا ہے' گویا یوں کہا جا رہا ہے:

''قُلْ اَعُوْذُ بِمَالِكِ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ''

''کہہ دیجیے کہہ میں پناہ مانگتا ہوں لوگوں کے مالک کی اور لوگوں کے بادشاہ کی۔''

تو ایجاز اور اختصار کی خاطر مالك اور ملك کی تکرار نہیں کی گئی بلکہ ''ربّ'' کے لفظ سے مالک کا مفہوم خود بخود حاصل ہو گیا۔

لیکن سورۃ الفاتحہ کی آیت ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ میں ایک خاص بات کہی گئی ہے جو کہ اس سے پہلی والی

آیت میں نہیں تھی کہ وہ یوم حساب کے دن کا بادشاہ ہے۔ یعنی دونوں آیات سے دو باتیں مقصود ہیں۔
﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ میں گو دنیا و آخرت دونوں شامل ہیں لیکن اگلی آیت میں آخرت (یَوْمِ الدِّیْنِ) کے خصوصی ذکر سے گویا پہلی آیت میں دنیا کا خاص تذکرہ مقصود ہے۔ یہاں وہ تفصیل نہیں جو سورۃ القصص (آیت ۷۰) میں پائی جاتی ہے:

﴿لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ۫﴾ (آیت ۷۰)

''اُسی کے لیے سب تعریفیں ہیں، پہلی (دنیا) میں بھی اور دوسری (آخرت) میں بھی۔''

اور اسی لیے سورۃ الفاتحہ کی دونوں قراءتوں سے اللہ کی دونوں صفات یعنی مالکیت اور بادشاہت کا اظہار ہو گیا۔ دنیا کی ربوبیت کا بھی اور آخرت کی بادشاہت کا بھی۔ برخلاف سورۃ آل عمران اور سورۃ الناس کی آیات کا، کہ وہاں ایک ہی آیت سے دونوں صفات بخوبی ظاہر ہو جاتی ہیں۔ گو آیت ایک ہی ہے لیکن مطلق ہے مقید نہیں، اس لیے دونوں حالتوں (دارِ دنیا اور دارِ آخرت) پر حاوی ہے۔

اگر آپ یہاں یہ سوال کریں کہ اس سے تو یہ معلوم ہوا کہ آیت ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ کا ایک خصوصی مفہوم ہے جو سورۃ الفاتحہ کی پہلی آیت سے بالکل جدا ہے، تو پھر یہ کیوں نہیں کہا جا سکتا کہ سورۃ الفاتحہ کی یہ دونوں آیتیں، آل عمران اور الناس کی آیتوں جیسی ہو گئیں، یعنی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ مَلِك بھی ہیں اور مالك بھی، لیکن یہ مفہوم ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ سے کیسے نکلے گا؟

جواباً عرض ہے کہ ربّ العالمین اپنے عموم کے اعتبار سے ہر مخلوق کو شامل ہے، تو جو ہستی سب کی رب ہے اور مالک ہے تو پھر ہر مخلوق اس کی تابع ہے اور اس کی حدودِ ملکیت کے اندر اندر ہے، کیونکہ اللہ کے سوا اور کسی کی ملکیت ثابت نہیں۔ اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ چاروں آیات سے یہ ثابت ہوا کہ اللہ ہی مَلِك ہے اور وہی مَالِك ہے۔ یعنی یہ بات تینوں آیات (الفاتحہ کی پہلی آیت اور آیت سورۃ آل عمران اور آیت الناس) کے مفہوم میں داخل ہے، لیکن ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ میں دونوں قراءتوں کا لحاظ کرنے سے سمجھ میں آتی ہے۔ گویا آیت ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ﴾ اور آیت ﴿مَلِكِ النَّاسِ﴾ میں اگر دوسری قراءت سے پڑھا جائے تو صرف تکرار ہو گی لیکن آیت (مالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ) میں دونوں قراءتوں کے لحاظ ہی سے مذکورہ مفہوم حاصل ہو گا۔ ❁❁❁

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝

وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم
ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان

سورۃ الانعام

آیات ۱ تا ۶

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ؕ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا
بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ ۝۱ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ
اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۝۲ وَهُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَفِی الْاَرْضِ ؕ یَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَیَعْلَمُ مَا
تَكْسِبُوْنَ ۝۳ وَمَا تَاْتِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ ۝۴ فَقَدْ كَذَّبُوْا
بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ؕ فَسَوْفَ یَاْتِیْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۵ اَلَمْ یَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ
قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَیْهِمْ مِّدْرَارًا ۪
وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِیْنَ ۝۶

م ك ن

مَكُنَ یَمْكُنُ (ک) مَكَانَةً: (۱) رتبہ والا ہونا' معزز ہونا۔ (۲) جما ہوا ہونا' با اختیار ہونا۔

مَكِیْنٌ (فَعِیْلٌ کے وزن پر صفت): (۱) رتبہ والا' معزز (۲) جما ہوا' مضبوط۔ ﴿اِنَّكَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا مَكِیْنٌ اَمِیْنٌ ۝۵۴﴾ (یوسف) ''بے شک تُو آج سے ہمارے پاس امانت دار معزز ہے۔'' ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ۝۱۳﴾ (المؤمنون) ''پھر ہم نے بنایا اس کو ایک نطفہ ایک مضبوط ٹھکانے میں۔''

اَمْكَنَ یُمْكِنُ (افعال) اِمْكَانًا: کسی کو کسی کے اختیار میں دینا' قابو میں دینا۔ ﴿فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ؕ﴾ (الانفال: ۷۱) ''تو وہ لوگ خیانت کر چکے ہیں اللہ سے اس سے پہلے نتیجتاً اس نے تمہارے قابو میں دیا ان میں سے کچھ کو۔''

مَكَّنَ يُمَكِّنُ (تفعیل) تَمْكِيْنًا : کسی کو اختیار دینا، جما دینا۔ ﴿وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِى الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ؕ﴾ (یوسف:٥٦) ''اور اس طرح ہم نے اختیار دیا یوسف کو زمین میں، وہ ٹھکانہ بناتا ہے اس میں جہاں بھی چاہے۔'' ﴿اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا﴾ (القصص:٥٧) ''تو کیا ہم نے نہیں جمایا ان کو امن والے حرم میں۔''

د ر ر

دَرَّ يَدُرُّ (ض) دَرًّا : اہلِ دنیا پر دنیا کی فراوانی ہونا۔

مِدْرَارٌ (مبالغہ) : بہت فراواں ہونے والا، لگاتار برسنے والا۔ آیت زیرِ مطالعہ۔

دَرَّ يَدَرُّ (س) دَرًّا : بیماری کے بعد چہرے پر رونق آ جانا، چمکدار ہونا۔

دُرِّيٌّ (اسم نسبت) : چمکنے والا، چمکدار۔ ﴿كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ﴾ (النور:٣٥) ''گویا کہ وہ ایک چمکدار ستارہ ہے۔''

ن ش ء

نَشَاَ يَنْشَاُ (ف) نَشْاً : کسی چیز کا نمایاں ہو کر سامنے آنا، اُگنا، اٹھنا۔

نَشْاَةٌ (اسم ذات) : نمو، اٹھان۔ ﴿ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ؕ﴾ (العنکبوت:٢٠) ''پھر اللہ اٹھائے گا آخری اٹھان۔''

نَاشِئَةٌ (اسم الفاعل) : اٹھنے والی۔ ﴿اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِىَ اَشَدُّ وَطْاً﴾ (المزمل:٦) ''بے شک رات کی اٹھنے والی یعنی تہجد کی نماز، یہ زیادہ سخت ہے بلحاظ روندنے کے۔''

اَنْشَاَ يُنْشِئُ (افعال) اِنْشَاءً : (١) اٹھانا۔ آیت زیرِ مطالعہ (٢) اگانا (٣) بنانا۔ ﴿وَهُوَ الَّذِىْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ﴾ (الانعام:١٤١) ''اور وہ ہے جس نے اگائے چھپر ڈالے ہوئے باغات۔'' ﴿وَهُوَ الَّذِىْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ؕ﴾ (المؤمنون:٧٨) ''اور وہ ہے جس نے بنایا تمہارے لیے سماعت اور بصارت اور دل۔''

مُنْشِئٌ (اسم الفاعل) : اُگانے والا۔ ﴿ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ ﴿٧٢﴾﴾ (الواقعۃ) ''کیا تم لوگوں نے اگایا اس کے درخت کو یا ہم اُگانے والے ہیں؟''

مُنْشَئَةٌ (اسم المفعول) : اٹھائی ہوئی۔ ﴿وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِى الْبَحْرِ﴾ (الرحمٰن:٢٤) ''اور اسی کی ہیں اونچی کی ہوئی کشتیاں سمندر میں۔''

نَشَّاَ يُنَشِّئُ (تفعیل) تَنْشِئَةً : پرورش کرنا، پالنا۔ ﴿اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِى الْحِلْيَةِ﴾ (الزخرف:١٨) ''تو کیا وہ، جو پرورش کیا گیا زیور میں۔''

ترکیب

''اَلْحَمْدُ'' پر لام جنس ہے۔ ''بِرَبِّهِمْ'' کو ''كَفَرُوْا'' کا مفعول بھی مانا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں ''يَعْدِلُوْنَ'' کا مفعول محذوف مانا جائے گا۔ ہماری ترجیح یہ ہے کہ ''كَفَرُوْا'' کا مفعول محذوف مانا جائے اور

''بِرَبِّهِمْ'' کو ''یَعْدِلُوْنَ'' کا مفعول مانا جائے۔ ''وَمَا تَاْتِیْهِمْ'' میں ''تَاْتِیْ'' واحد مؤنث کا صیغہ ہے' اس کا فاعل ''اٰیَةٌ'' تھا جس پر ''مِنْ تبعیضیہ لگنے کی وجہ سے ''اٰیَةٍ'' ہوا ہے۔ ''یَاْتِیْهِمْ'' کا فاعل ''اَنْبٰٓؤُ'' ہے اور یہ مضاف ہے' اس کا مضاف الیہ ''مَا'' ہے۔ ''قَرْنٍ'' نکرہ مخصوصہ ہے۔ ''قَرْنًا'' اسم الجمع ہے۔ اس لیے اس کی صفت ''اٰخَرِیْنَ'' جمع آئی ہے۔

ترجمہ:

اَلْحَمْدُ : تمام تعریف اور شکر	لِلّٰهِ الَّذِیْ : اُس اللہ کے لیے ہے جس نے
خَلَقَ : پیدا کیے	السَّمٰوٰتِ : آسمان
وَالْاَرْضَ : اور زمین	وَجَعَلَ : اور بنائے
الظُّلُمٰتِ : اندھیرے	وَالنُّوْرَ : اور نور
ثُمَّ : پھر (بھی)	الَّذِیْنَ : وہ لوگ جنہوں نے
كَفَرُوْا : کفر کیا	بِرَبِّهِمْ : اپنے رب کے
یَعْدِلُوْنَ : برابر کرتے ہیں	هُوَ : وہ
الَّذِیْ : وہ ہے جس نے	خَلَقَكُمْ : تم لوگوں کو پیدا کیا
مِّنْ طِیْنٍ : ایک گارے سے	ثُمَّ : پھر
قَضٰٓی : اس نے فیصلہ کیا	اَجَلًا : ایک مدت کا
وَاَجَلٌ مُّسَمًّی : اور کوئی معین وقت	عِنْدَهٗ : اس کے پاس ہے
ثُمَّ : پھر (بھی)	اَنْتُمْ : تم لوگ
تَمْتَرُوْنَ : شک کرتے ہو	وَهُوَ : اور وہی
اللّٰهُ : اِلٰہ ہے	فِی السَّمٰوٰتِ : آسمانوں میں
وَفِی الْاَرْضِ : اور زمین میں	یَعْلَمُ : وہ جانتا ہے
سِرَّكُمْ : تمہارے چھپانے کو	وَجَهْرَكُمْ : اور تمہارے نمایاں کرنے کو
وَیَعْلَمُ : اور وہ جانتا ہے	مَا : اس کو جو
تَكْسِبُوْنَ : تم لوگ کمائی کرتے ہو	وَمَا تَاْتِیْهِمْ : اور نہیں پہنچتی ان کے پاس
مِّنْ اٰیَةٍ : کسی قسم کی کوئی نشانی	مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّهِمْ : ان کے رب کی نشانیوں میں سے
اِلَّا : مگر	كَانُوْا : وہ لوگ ہوتے ہیں
عَنْهَا : اس سے	مُعْرِضِیْنَ : اعراض کرنے والے
فَقَدْ كَذَّبُوْا : تو وہ لوگ جھٹلا چکے ہیں	بِالْحَقِّ : حق کو
لَمَّا : جب	جَآءَهُمْ : وہ آیا ان کے پاس

فَسَوْفَ : تو عنقریب
اَنْۢبٰٓؤُا مَا : اس کی خبریں

اَ : کیا
كَمْ اَهْلَكْنَا : ہم نے کتنی ہی ہلاک کیں
مِّنْ قَرْنٍ : ایسی قوموں میں سے
فِي الْاَرْضِ : زمین میں
لَمْ نُمَكِّنْ : اختیار ہم نے نہیں دیا
وَاَرْسَلْنَا : اور ہم نے بھیجا
عَلَيْهِمْ : ان پر
وَّجَعَلْنَا : اور ہم نے بنائیں
تَجْرِيْ : وہ بہتی تھیں
فَاَهْلَكْنٰهُمْ : پھر ہم نے ہلاک کیا ان کو
وَاَنْشَاْنَا : اور ہم نے اٹھائیں
قَرْنًا اٰخَرِيْنَ : کچھ دوسری قومیں

يَاْتِيْهِمْ : پہنچیں گی ان کے پاس
كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ : جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے
لَمْ يَرَوْا : انہوں نے دیکھا ہی نہیں
مِنْ قَبْلِهِمْ : ان سے پہلے
مَّكَّنّٰهُمْ : ہم نے اختیار دیا جن کو
مَا : ایسا' جو
لَّكُمْ : تم لوگوں کو
السَّمَآءَ : آسمان کو
مِّدْرَارًا : لگاتار برستے ہوئے
الْاَنْهٰرَ : نہریں
مِنْ تَحْتِهِمْ : ان کے نیچے
بِذُنُوْبِهِمْ : ان کے گناہوں کے سبب
مِنْۢ بَعْدِهِمْ : ان کے بعد

نوٹ ۱: یہ پوری سورہ مکہ میں بیک وقت نازل ہوئی تھی اور جس رات یہ نازل ہوئی اسی رات رسول اللہ ﷺ نے اسے قلمبند کرادیا۔ اس کے مخاطب اول مشرکین عرب تھے جو یہ تسلیم کرتے تھے کہ زمین و آسمان کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور اسی نے آفتاب و ماہتاب کو وجود بخشا ہے۔ ان میں سے کسی کا بھی یہ عقیدہ نہ تھا کہ یہ کام لات یا ہبل یا عزی یا کسی اور دیوی یا دیوتا کا ہے۔ اس لیے ان کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ جب تم خود اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہو تو پھر دوسرے کے سامنے کیوں سجدے کرتے ہو' دعائیں مانگتے ہو اور نذر و نیاز پیش کرتے ہو۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ ۲: زیر مطالعہ آیت ۵ میں عنقریب خبریں پہنچنے کی جو بات کی گئی ہے اس میں ہجرت اور ان کامیابیوں کی طرف اشارہ ہے جو ہجرت کے بعد پے در پے اسلام کو حاصل ہونے والی تھیں۔ جس وقت یہ اشارہ فرمایا گیا تھا اس وقت نہ کفار یہ گمان کرسکتے تھے کہ کس قسم کی خبریں انہیں پہنچنے والی ہیں اور نہ مسلمانوں کے ہی ذہن میں اس کا کوئی تصور تھا۔ (تفہیم القرآن)

آیات ۷ تا ۱۱

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ

مُّبِيْنٌ ۝۷ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۭ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝۸ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝۹ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۱۰ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۱۱

ق ر ط س

قَرْطَسَ يُقَرْطِسُ (رباعی) قِرْطَاسًا: نشانے پر پہنچنا۔

قِرْطَاسٌ (جمع قَرَاطِيْسُ): اسم ذات ہے۔ ہر وہ چیز جس پر لکھا جائے۔ کاغذ' ورق۔ آیت زیر مطالعہ اور ﴿تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ﴾ (الانعام: ۹۱) ''تم لوگ بناتے ہو اس کے اوراق یعنی اوراق میں نقل کر رکھا ہے۔''

ح ی ق

حَاقَ يَحِيْقُ (ض) حَيْقًا: کسی چیز کو گھیرے میں لینا' چھا جانا۔ آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب

''فَلَمَسُوْهُ'' کی ضمیر مفعولی کو ''كِتَابًا'' کے لیے مانیں یا ''قِرْطَاسٍ'' کے لیے' مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ''وَلَوْ جَعَلْنٰهُ'' کی ضمیر مفعولی ''رَسُوْلًا'' کے لیے ہے جو ''عَلَيْكَ'' کے حوالے سے ہے۔ ''مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ'' یہ پورا جملہ ''فحاق'' کا فاعل ہے جبکہ ''بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ'' اس کا مفعول ہے۔ ''مِنْهُمْ'' کی ضمیر ''بِرُسُلٍ'' کے لیے ہے۔ ''عَاقِبَةُ'' مؤنث غیر حقیقی ہے اس لیے ''كَانَتْ'' کے بجائے ''كَانَ'' بھی جائز ہے۔

ترجمہ:

وَلَوْ: اور اگر	نَزَّلْنَا: ہم اتارتے
عَلَيْكَ: آپؐ پر	كِتٰبًا: کوئی کتاب
فِيْ قِرْطَاسٍ: کسی ورق میں (لکھی ہوئی)	فَلَمَسُوْهُ: پھر وہ چھوتے اس کو
بِاَيْدِيْهِمْ: اپنے ہاتھوں سے	لَقَالَ: تو ضرور کہتے
الَّذِيْنَ: وہ لوگ جنہوں نے	كَفَرُوْٓا: کفر کیا
اِنْ: نہیں ہے	هٰذَآ: یہ
اِلَّا: مگر	سِحْرٌ مُّبِيْنٌ: ایک کھلا جادو
وَقَالُوْا: اور انہوں نے کہا	لَوْلَآ: کیوں نہیں
اُنْزِلَ: اتارا گیا	عَلَيْهِ: انؐ پر
مَلَكٌ: کوئی فرشتہ	وَلَوْ: اور اگر
اَنْزَلْنَا: ہم اتارتے	مَلَكًا: کوئی فرشتہ

لَّقُضِیَ : تو فیصلہ کر دیا جاتا
ثُمَّ : پھر
وَلَوْ : اور اگر
مَلَکًا : ایک فرشتہ
رَجُلًا : ایک مرد
عَلَیْهِمْ : ان پر
یَلْبِسُوْنَ : یہ لوگ شک کرتے ہیں
بِرُسُلٍ : رسولوں کا
فَحَاقَ : تو گھیرے میں لے لیا
سَخِرُوْا : تمسخر کیا
مَّا : اس نے
قُلْ : آپؐ کہہ دیجیے
فِی الْاَرْضِ : زمین میں
کَیْفَ : کیسا
عَاقِبَةُ الْمُکَذِّبِیْنَ : جھٹلانے والوں کا انجام

الْاَمْرُ : تمام کاموں کا
لَا یُنْظَرُوْنَ : وہ لوگ مہلت نہ دیے جاتے
جَعَلْنٰهُ : ہم بناتے اس (رسول) کو
لَّجَعَلْنٰهُ : تو ہم بناتے اس کو
وَّلَلَبَسْنَا : اور ہم ضرور مشتبہ کرتے
مَّا : اس کو جو
وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ : اور بے شک مذاق اڑایا گیا ہے
مِّنْ قَبْلِكَ : آپؐ سے پہلے
بِالَّذِیْنَ : ان کو جنہوں نے
مِنْهُمْ : ان سے
کَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ : جو یہ لوگ مذاق اڑایا کرتے تھے
سِیْرُوْا : تم لوگ چلو پھرو
ثُمَّ انْظُرُوْا : پھر دیکھو
کَانَ : تھا

نوٹ۱: علم الیقین کی اہمیت پر البقرۃ' آیت ۵۵ کے نوٹ ۳ میں اور آیت ۱۱۸ کے نوٹ ۳ میں بات ہو چکی ہے۔ ہمارا مشورہ ہے کہ پہلے آپ ان کو پڑھ لیں' اس کے بعد مندرجہ ذیل نوٹ پڑھیں جو ہم تفہیم القرآن سے نقل کر رہے ہیں۔ زیر مطالعہ آیت ۸ میں فرمایا کہ اگر ہم کوئی فرشتہ اتارتے پھر سارے معاملے کا فیصلہ کر دیا جاتا اور ان کو پھر کوئی مہلت نہ دی جاتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لینے کے لیے جو مہلت تمہیں ملی ہوئی ہے یہ اس وقت تک ہے جب تک حقیقت پردۂ غیب میں پوشیدہ ہے۔ ورنہ جہاں غیب کا پردہ چاک ہوا' پھر مہلت کا کوئی موقع باقی نہ رہے گا' کیونکہ اس کے بعد تو صرف حساب ہی لینا باقی رہ جائے گا۔ دنیا کی زندگی ایک امتحان کا زمانہ ہے اور امتحان اس بات کا ہے کہ تم حقیقت کو دیکھے بغیر ،عقل و فکر کے صحیح استعمال سے' اس کا ادراک کرتے ہو یا نہیں۔ اور ادراک کرنے کے بعد اپنے نفس اور اس کی خواہشات کو قابو میں لا کر اپنے عمل کو حقیقت کے مطابق درست رکھتے ہو یا نہیں۔ اس امتحان کے لیے غیب کا غیب رہنا شرط لازم ہے اور دنیوی زندگی' جو دراصل مہلتِ امتحان ہے' اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک

غیب غیب ہے۔ جہاں غیب شہادت میں تبدیل ہوا' یہ مہلت لازماً ختم ہو جائے گی اور امتحان کے بجائے نتیجۂ امتحان نکلنے کا وقت آ پہنچے گا۔

آیات ۱۲ تا ۱۸

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى
يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ
وَالنَّهَارِ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳﴾ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ
يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ؕ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۴﴾
قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾ مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ
رَحِمَهٗ ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ؕ وَاِنْ
يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۸﴾

ف ط ر

فَطَرَ يَفْطِرُ (ض) وَفَطَرَ يَفْطُرُ (ن) فَطْرًا : کسی چیز کو پھاڑ کر کسی چیز کو نکالنا۔ (۱) پھاڑنا (۲) وجود میں لانا۔ ﴿فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ؕ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ﴾ (بنی اسراء یل:۵۱) ''پھر وہ لوگ کہیں گے کون دوبارہ لائے گا ہم کو؟ آپؐ کہہ دیجیے وہ جس نے وجود بخشا تم لوگوں کو پہلی مرتبہ۔''

فِطْرَةٌ (اسم ذات) : کسی وجود کو دی ہوئی طبعی استعداد۔ ﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ﴾ (الروم:۳۰) ''اللہ کی بخشی ہوئی وہ طبعی استعداد' اس نے وجود بخشا لوگوں کو جس پر۔''

فَاطِرٌ (اسم الفاعل) : وجود میں لانے والا۔ آیت زیر مطالعہ۔

فَطْرٌ ج فُطُوْرٌ (اسم ذات بھی ہے) : پھٹن' شگاف۔ ﴿هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝۳﴾ (الملك) ''کیا تُو نے دیکھے کسی قسم کے کوئی شگاف؟''

تَفَطَّرَ يَتَفَطَّرُ (تفعیل) تَفَطُّرًا : بتکلف پھٹنا یعنی پھٹ پڑنا۔ ﴿تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ﴾ (مریم:۹۰) ''قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں اس سے۔''

اِنْفَطَرَ يَنْفَطِرُ (انفعال) اِنْفِطَارًا : پھٹنا۔ ﴿اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝۱﴾ (الانفطار) ''جب آسمان پھٹے گا۔''

مُنْفَطِرٌ (اسم الفاعل) : پھٹنے والا۔ ﴿اَلسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ بِهٖ ؕ﴾ (المزمل:۱۸) ''آسمان پھٹنے والا ہے اس سے۔''

ك ش ف

كَشَفَ يَكْشِفُ (ض) كَشْفًا : (۱) کسی چیز سے پردہ اٹھانا (۲) کھولنا۔ (۳) ہٹانا' دور کرنا۔ ﴿فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ؕ﴾ (النمل:۴۴) ''پھر جب اس نے دیکھا اس کو تو اس نے

گمان کیا اس کو گہرا پانی اور اس نے پردہ اٹھایا اپنی دونوں پنڈلیوں سے۔''﴿لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ﴾ (قٓ:۲۲) ''بے شک تُو غفلت میں تھا اس سے تو ہم نے کھول دیا تجھ سے تیرے سرپوش کو۔''﴿فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ﴾ (الزخرف:۵۰) ''پھر جب ہم نے ہٹا دیا ان سے عذاب کو۔''

اِكْشِفْ (فعل امر): تُو کھول، تُو ہٹا۔﴿رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ﴾ (الدخان:۱۲) ''اے ہمارے رب تو دور کر ہم سے اس عذاب کو۔''

كَاشِفٌ (اسم الفاعل): کھولنے والا، ہٹانے والا۔آیت زیر مطالعہ۔

ق ہ ر

قَهَرَ يَقْهَرُ (ف) قَهْرًا: کسی پر غلبہ پا کر اسے ذلیل کرنا۔(۱) غالب ہونا۔(۲) ذلیل کرنا۔﴿فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝۹﴾ (الضحی) ''پس جو یتیم ہو تو، تُو ذلیل مت کر۔''

قَاهِرٌ (فَاعِلٌ کے وزن پر صفت): غالب ہونے والا یعنی غالب۔آیت زیر مطالعہ۔

قَهَّارٌ (فَعَّالٌ کے وزن پر صفت): بہت زیادہ غالب یعنی زبردست﴿وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝۱۶﴾ (الرعد) ''اور وہ یکتا ہے، زبردست ہے۔''

ترکیب

''غَيْرَ اللّٰهِ'' میں ''غَيْرَ'' کی نصب بتا رہی ہے کہ یہ ''اَتَّخِذُ'' کا مفعول اوّل ہے، ''وَلِيًّا'' مفعول ثانی ہے۔''فَاطِرِ'' کی جر بتا رہی ہے کہ یہ ''اللّٰهِ'' کا بدل ہے اور مضاف ہے، جبکہ ''اَلسَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' اس کا مضاف الیہ ہے۔''اَوَّلَ'' بھی مضاف ہے اور ''مَنْ'' مضاف الیہ ہے۔''اَخَافُ'' کا مفعول ''عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ'' ہے اور یہ جملہ جوابِ شرط ہے ''اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ'' کا۔''عَنْهُ'' کی ضمیر ''عَذَابَ'' کے لیے ہے۔ ''رَحِمَهٗ'' میں ضمیر فاعلی ''هُوَ'' ہے جو اللہ کے لیے ہے اور ضمیر مفعولی ''مَنْ'' کے لیے ہے۔

ترجمہ:

قُلْ: آپؐ کہیے	لِّمَنْ: کس کا ہے
مَّا: وہ جو	فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: زمین اور آسمانوں میں ہے
قُلْ: آپؐ کہیے	لِلّٰهِ: اللہ کا ہے
كَتَبَ: اُس نے لکھا	عَلٰى نَفْسِهِ: اپنے آپ پر
الرَّحْمَةَ: رحمت کو	لَيَجْمَعَنَّكُمْ: وہ لازماً جمع کرے گا تم لوگوں کو
اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ: قیامت کے دن کی طرف	لَا رَيْبَ: کوئی بھی شک نہیں ہے
فِيْهِ: جس میں	اَلَّذِيْنَ: جنہوں نے
خَسِرُوْٓا: گھاٹے میں ڈالا	اَنْفُسَهُمْ: اپنے نفس کو

فَهُمْ :تو وہ لوگ
وَلَهٗ :اور اُسی کا ہے
سَكَنَ :ٹھہرا
وَالنَّهَارِ :اور دن میں
السَّمِيْعُ :ہر حال میں سننے والا ہے
قُلْ :آپؐ کہیے
غَيْرَ اللّٰهِ :اللہ کے علاوہ (کسی) کو
وَلِيًّا :کارساز
وَهُوَ :اور وہ
وَلَا يُطْعَمُ :اور اس کو کھلایا نہیں جاتا
اِنِّيْٓ :کہ
اَنْ :کہ
اَوَّلَ مَنْ :اس کا پہلا جو
وَ :اور (یہ کہ)
مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ: شرک کرنے والوں میں سے
اِنِّيْٓ :کہ
اِنْ :اگر
رَبِّيْ :اپنے رب کی
مَنْ :جو
عَنْهُ :اس سے
فَقَدْ رَحِمَهٗ :تو اس نے رحم کیا ہے اس پر
الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ :کھلی کامیابی ہے
يَّمْسَسْكَ :چھوئے تجھ کو
بِضُرٍّ :کسی تکلیف سے

لَا يُؤْمِنُوْنَ :ایمان نہیں لاتے ہیں
مَا :وہ جو
فِي الَّيْلِ :رات میں
وَهُوَ :اور وہ
الْعَلِيْمُ :ہر حال میں جاننے والا ہے
اَ :کیا
اَتَّخِذُ :میں بناؤں
فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ : جو زمین اور آسمانوں کو وجود بخشنے والا ہے
يُطْعِمُ :کھلاتا ہے
قُلْ :آپؐ کہیے
اُمِرْتُ :مجھ کو حکم دیا گیا
اَكُوْنَ :میں ہو جاؤں
اَسْلَمَ :فرمانبردار ہوا
لَا تَكُوْنَنَّ :تم ہرگز مت ہونا
قُلْ :آپؐ کہیے
اَخَافُ :میں ڈرتا ہوں
عَصَيْتُ :میں نافرمانی کروں
عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ :ایک عظیم دن کے عذاب سے
يُّصْرَفْ :ہٹا لیا گیا
يَوْمَئِذٍ :اس دن
وَذٰلِكَ :اور یہ
وَاِنْ :اور اگر
اللّٰهُ :اللہ
فَلَا كَاشِفَ :تو کوئی بھی دور کرنے والا نہیں ہے

لَہٗ :اس کو
هُوَ :وہی
یَّمْسَسْكَ :وہ چھوئے تجھ کو
فَهُوَ :تو وہ
قَدِیْرٌ :قدرت رکھنے والا ہے
الْقَاهِرُ :غالب ہے
وَهُوَ :اور وہ
الْخَبِیْرُ :باخبر ہے

اِلَّا :مگر
وَاِنْ :اور اگر
بِخَیْرٍ :کسی بھلائی سے
عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ :ہر چیز پر
وَهُوَ :اور وہ
فَوْقَ عِبَادِهٖ :اپنے بندوں پر
الْحَكِیْمُ :حکمت والا ہے

نوٹ۱: زیر مطالعہ آیت ۱۷ میں اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ بیان کیا گیا ہے کہ ہر نفع اور نقصان کا مالک درحقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ ظاہر میں جو کسی کو کسی کے ہاتھ سے نفع یا نقصان پہنچتا نظر آتا ہے وہ صرف ایک ظاہری صورت ہے اور حقیقت کے سامنے ایک نقاب ہے' حقیقت یہی ہے کہ اللہ جو دے دے اسے کوئی روک نہیں سکتا اور جو روک لے تو کوئی دے نہیں سکتا (فاطر:۲) رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جب تم کوئی سوال کرو تو صرف اللہ سے سوال کرو اور مدد مانگنی ہو تو صرف اللہ سے مدد مانگو۔ اتنی واضح تعلیمات کے باوجود لوگ اس معاملہ میں بھٹکتے ہیں۔ سارے خدائی اختیارات مخلوقات میں بانٹ دیے ہیں اور مصیبت کے وقت اللہ کے بجائے مختلف ناموں کی دہائی دیتے ہیں اور انہی سے مدد مانگتے ہیں۔ (معارف القرآن)

نوٹ۲: مادہ ''ف ط ر'' کی لغت میں لفظ فطرۃ کی وضاحت میں ہم نے سورۃ الروم کی آیت ۳۰ کا حوالہ دیا ہے اور فِطْرَتَ اللّٰهِ کا ترجمہ ''اللہ کی فطرت'' کے بجائے ''اللہ کی بخشی ہوئی فطرت'' کیا ہے۔ یہ ہمارے بزرگوں کے ترجمے کے مطابق ہے' صرف الفاظ کے انتخاب کا فرق ہے۔ مثلاً مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ ہے ''اللہ کی دی ہوئی قابلیت''۔ مولانا احمد رضا خان کا ترجمہ ہے ''اللہ کی ڈالی ہوئی بنا''۔ جبکہ حضرت شیخ الہند اور مفتی محمد شفیع کا ترجمہ ہے ''تراش اللہ کی''۔

مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے اکثر تعلیم یافتہ لوگوں میں یہ عقیدہ اللہ جانے کہاں سے پھیل گیا ہے کہ اللہ نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے (نعوذ باللہ من ذالک)۔ ایسے لوگوں کو شک ہے اور بعض کو تو یقین ہے' کہ اس آیت کے ترجمے میں ہمارے بزرگوں نے اپنی رائے کی رعایت کی ہے' جو کہ آیت کا حقیقی مفہوم نہیں ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ فِطْرَتَ اللّٰهِ مرکب اضافی ہے اور اس کا صحیح ترجمہ ہے ''اللہ کی فطرت''۔ اس لیے آیت کا مطلب ہے ''اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا''۔ اس دلیل میں جو غلطی ہے اس کی وضاحت ضروری ہے۔ اصولاً یہ وضاحت ہمیں سورۃ الروم میں کرنی چاہیے تھی' لیکن صورتحال یہ ہے کہ ان اسباق کو مرتب کرنے کا کام ۲۸ اگست ۱۹۹۸ء کو شروع کیا تھا اور آج ۲۵ فروری ۲۰۰۳ء کو ہم سورۃ الانعام کے آغاز میں ہیں۔ اللہ جانے سورۃ الروم تک پہنچنا نصیب ہوگا یا نہیں۔ اس لیے یہ قرض یہیں چکا دیا جائے تو بہتر ہے۔ بات ذرا تلخ ہے' لیکن بات یہی ہے کہ فَعَلَ ۔ فَعَلَا ۔ فَعَلُوا سے فَعَلْنَا تک چودہ صیغے پڑھ لینے سے ہمارے چودہ طبق تو روشن ہو جاتے

ہیں‘ لیکن اس چکا چوند کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اب ہم اپنے بزرگوں سے زیادہ قابل ہو گئے ہیں اور اب ہم قرآن کو ان سے زیادہ سمجھنے لگے ہیں۔ آسان عربی گرامر‘ حصہ سوم کے آخری باب ’’سبق الاسباق‘‘ میں اسی خطرے کی نشان دہی کی جا چکی ہے۔ طلبہ کو چاہیے کہ کبھی کبھی وہ اس کا مطالعہ کرتے رہیں۔

مذکورہ دلیل میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے مرکب اضافی کا صحیح ترجمہ کرنا تو سیکھ لیا ہے لیکن مرکب اضافی کا صحیح مفہوم ابھی تک ان کے ذہن میں اجاگر نہیں ہوا ہے۔ ہم کہتے ہیں زید کا قلم‘ زید کی کتاب۔ یہ مرکب اضافی تو ہے‘ لیکن مرکب اضافی کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ قلم اور کتاب زید کی ذات کا جز ہیں‘ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ قلم اور کتاب کو زید کی ذات کے ساتھ ایک نسبت ہے اور ان مرکبات میں ملکیت کی نسبت کا مفہوم ہے۔ زید کا بھائی‘ زید کی بہن‘ ان مرکبات اضافی میں رشتوں کی نسبت کا مفہوم ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں ہے۔ ﴿اِنِّیۡ عَبۡدُ اللّٰہِ ؕ﴾ (مریم: ۳۰) ’’بیشک میں اللہ کا بندہ ہوں‘‘ ﴿وَاَرۡضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃٌ ؕ﴾ (الزمر: ۱۰) ’’اور اللہ کی زمین وسیع ہے‘‘۔ ﴿اِنَّ اَرۡضِیۡ وَاسِعَۃٌ﴾ (العنکبوت: ۵۶) ’’بیشک میری زمین وسیع ہے‘‘۔ ﴿وَنَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ﴾ (الحجر: ۲۹) ’’اور میں پھونک دوں اس میں اپنی روح میں سے‘‘۔ ان میں بندہ‘ زمین یا روح‘ کوئی بھی چیز اللہ تعالیٰ کی ذات کا جز نہیں ہے۔ ان مرکبات اضافی کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے ایک نسبت ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ چیزیں اس کی تخلیق کردہ ہیں‘ اس لیے اس کی ملکیت ہیں۔ اسی طرح اس کائنات کی ہر چیز کا وجود اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے اور ہر وجود کی فطرت اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی ہے۔ اس لیے ان سب کو اللہ تعالیٰ سے ایک نسبت ہے‘ تخلیق ہونے کی اور ملکیت ہونے کی۔ کوئی بھی چیز اس کی ذات کا جز نہیں ہے۔ ﴿لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ ۚ﴾ (الشوریٰ: ۱۱) ’’اس کے جیسی کوئی بھی چیز نہیں ہے۔‘‘

دوسری بات یہ ہے کہ جو لوگ اپنے عقیدے کی تصدیق کے لیے اس آیت کا حوالہ دیتے ہیں انھیں نوٹ کرنا چاہیے کہ یہ آیت کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس کو پوری آیت میں رکھ کر اگر غور کریں گے تو انہیں سوچنا پڑے گا کہ لفظ فطرتُ اللّٰہ (حالتِ رفع) کے بجائے فطرتَ اللّٰہ (حالتِ نصب میں) کیوں ہے۔ اس کی وجہ سمجھنے کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ آیت کا وہ مطلب نہیں ہے جس کے وہ مدعی ہیں اور ہمارے بزرگوں نے ترجمہ میں اپنے عقیدے کی رعایت نہیں کی ہے بلکہ ’’پڑھے کم‘ بولے زیادہ‘‘ قسم کے لوگوں کی رعایت کی ہے تاکہ ان کا عقیدہ قرآن کے مطابق رہے۔ اس حوالے سے اب یہ موتی گرہ میں باندھ لیں کہ قرآن مجید پر غور و فکر کرتے ہوئے بزرگوں کی کوئی بات اگر سمجھ میں نہ آئے تو اس کا صرف ایک مطلب ہے کہ ہماری اپنی سوجھ بوجھ ابھی خام ہے۔ البتہ بزرگوں کی عقیدت و محبت سے اس کو اگر ہم ذرا نم کرلیں تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے۔

آیات ۱۹ تا ۲۴

قُلۡ اَیُّ شَیۡءٍ اَکۡبَرُ شَہَادَۃً ؕ قُلِ اللّٰہُ ۙ۫ شَہِیۡدٌۢ بَیۡنِیۡ وَبَیۡنَکُمۡ ۟ وَاُوۡحِیَ اِلَیَّ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَکُمۡ بِہٖ وَمَنۡۢ بَلَغَ ؕ اَئِنَّکُمۡ لَتَشۡہَدُوۡنَ اَنَّ مَعَ اللّٰہِ اٰلِہَۃً اُخۡرٰی ؕ قُلۡ لَّاۤ اَشۡہَدُ ۚ قُلۡ اِنَّمَا

هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ
اَبْنَآءَهُمْ ؕ اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ
كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَیَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ
اَشْرَكُوْٓا اَیْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِیْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا
مَا كُنَّا مُشْرِكِیْنَ ﴿۲۳﴾ اُنْظُرْ كَیْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

وضاحت

اب آیات میں نئے الفاظ کی تعداد کم ہوگئی ہے' اس لیے ان کے نمبروں کا حوالہ دے کر نئے لفظ کی لغت دی جائے گی' اگر کوئی نیا لفظ ہوا تو۔ اسی طرح اگر ضروری ہوا تو ترکیب کی وضاحت کی جائے گی' ورنہ براہِ راست ترجمہ دے کر نوٹس دیے جائیں گے۔

ترکیب

مرکب اضافی ''اَیُّ شَیْءٍ'' مبتدا ''اَكْبَرُ'' خبر اور ''شهادَةً'' تمیز ہے۔ ''شَهِیْدٌ'' کو ''اللّٰه'' کی خبر بھی مانا جاسکتا ہے۔ ایسی صورت میں ''اَیُّ شَیْءٍ'' کا جواب محذوف مانا جائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ''قُلِ اللّٰهُ'' کو ''اَیُّ شَیْءٍ'' کا جواب مانا جائے اور ''شَهِیْدٌ بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ'' کو الگ جملہ مانا جائے۔ ایسی صورت میں ''شَهِیْدٌ'' کا مبتدا ''هُوَ'' محذوف مانا جائے گا۔ ترجمے میں ہم دوسری صورت کو ترجیح دیں گے۔ ''وَمَنْ بَلَغَ'' میں ''مَنْ'' گزشتہ ''لِاُنْذِرَ'' کا بھی مفعول ہے اور ''بَلَغَ'' کا بھی' اور ''بَلَغَ'' کی ضمیر فاعلی ''هٰذَا الْقُرْاٰنُ'' کے لیے ہے۔ ''اَنَّ'' کا اسم ''اِلٰهَةً اُخْرٰی'' ہے' اس کی خبر محذوف ہے اور ''مَعَ اللّٰهِ'' قائم مقام خبر مقدم ہے۔ آیت ''یَعْرِفُوْنَهٗ'' میں شامل ضمیر فاعلی هُمْ ''اَلَّذِیْنَ'' کے لیے ہے جب کہ اس کی ضمیر مفعولی کو ''هٰذَا الْقُرْاٰنُ'' کے لیے بھی مانا جاسکتا ہے اور ''قُلْ'' کے مخاطب رسول اللہ ﷺ کے لیے بھی۔ مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑتا' کیونکہ ایک کی پہچان سے دوسرے کی پہچان لازمی ہے۔ (آیت ۲۲) ''اِنَّهٗ'' میں ضمیر ''الشان'' ہے۔
(وضاحت کے لیے دیکھئے البقرۃ: ۸۵۔ نوٹ ۱)

ترجمہ:

قُلْ : آپؐ کہیے
اَكْبَرُ : سب سے بڑی ہے
قُلِ : آپؐ کہیے
شَهِیْدٌ : (وہ) گواہ ہے
وَبَیْنَكُمْ : اور تمہارے درمیان
اِلَیَّ : میری طرف
لِاُنْذِرَكُمْ : تاکہ میں وارننگ دوں تم لوگوں کو

اَیُّ شَیْءٍ : کون سی چیز
شَهَادَةً : بطور گواہی کے
اللّٰهُ : (کہ) اللہ
بَیْنِیْ : میرے درمیان
وَاُوْحِیَ : اور وحی کیا گیا
هٰذَا الْقُرْاٰنُ : اس قرآن کو
بِهٖ : اس سے

وَمَنْ : اور اُس کو جس کو
اَئِنَّكُمْ : کیا واقعی تم لوگ
اَنَّ : کہ
اٰلِهَةً اُخْرٰى : کچھ دوسرے الٰہ (بھی) ہیں
لَّآ اَشْهَدُ : میں گواہی نہیں دیتا
اِنَّمَا : کچھ نہیں سوائے اس کے کہ
اِلٰهٌ وَّاحِدٌ : واحد الٰہ ہے
بَرِیْٓءٌ : بری ہوں
تُشْرِكُوْنَ : تم لوگ شرک کرتے ہو
اٰتَيْنٰهُمُ : ہم نے دی جن کو
يَعْرِفُوْنَهٗ : وہ پہچانتے ہیں اس کو
يَعْرِفُوْنَ : وہ پہچانتے ہیں
اَلَّذِيْنَ : وہ لوگ جنہوں نے
اَنْفُسَهُمْ : اپنے نفوس کو
لَا يُؤْمِنُوْنَ : ایمان نہیں لاتے
اَظْلَمُ : زیادہ ظالم ہے
افْتَرٰى : گھڑا
كَذِبًا : ایک جھوٹ
كَذَّبَ : جس نے جھٹلایا
اِنَّهٗ : بیشک حقیقت یہی ہے کہ
الظّٰلِمُوْنَ : ظلم کرنے والے
نَحْشُرُهُمْ : ہم جمع کریں گے ان کو
ثُمَّ : پھر
لِلَّذِيْنَ : ان سے جنہوں نے
اَيْنَ : کہاں ہیں
كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ : تم لوگ زعم کیا کرتے تھے
لَمْ تَكُنْ : نہیں ہوگی

بَلَغَ : وہ پہنچے
لَتَشْهَدُوْنَ : سچ مچ گواہی دیتے ہو
مَعَ اللّٰهِ : اللہ کے ساتھ
قُلْ : آپؐ کہیے
قُلْ : آپؐ کہیے
هُوَ : وہ
وَّاِنَّنِيْ : اور یہ کہ میں
مِّمَّا : اس سے جو
اَلَّذِيْنَ : وہ لوگ
الْكِتٰبَ : کتاب
كَمَا : جیسا کہ
اَبْنَآءَهُمْ : اپنے بیٹوں کو
خَسِرُوْٓا : گھاٹے میں ڈالا
فَهُمْ : تو وہ لوگ
وَمَنْ : اور کون
مِمَّنِ : اس سے جس نے
عَلَى اللّٰهِ : اللہ پر
اَوْ : یا
بِاٰيٰتِهٖ : اُس کی نشانیوں کو
لَا يُفْلِحُ : مراد نہیں پاتے
وَيَوْمَ : اور اس دن
جَمِيْعًا : سب کے سب کو
نَقُوْلُ : ہم کہیں گے
اَشْرَكُوْٓا : شرک کیا
شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ : تمہارے وہ شریک (کیے ہوئے) لوگ جن کا
ثُمَّ : پھر
فِتْنَتُهُمْ : ان کی گمراہی

اِلَّآ :مگر
قَالُوْا :وہ کہیں گے
رَبِّنَا :جو ہمارا رب ہے
مُشْرِکِیْنَ :شرک کرنے والے
کَیْفَ :کیسا
عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ :اپنے آپ پر
عَنْھُمْ :ان سے
کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ :وہ لوگ گھڑا کرتے تھے

اَنْ :(یہ) کہ
وَاللّٰہِ :اللہ کی قسم
مَا کُنَّا :ہم نہیں تھے
اُنْظُرْ :دیکھو
کَذَبُوْا :انہوں نے جھوٹ بولا
وَضَلَّ :اور گمراہ ہوا (یعنی گم ہوا)
مَّا :وہ، جو

نوٹ۱: زیرِ مطالعہ آیت ۱۹ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر یہ قرآن مجید اس لیے وحی کیا گیا کہ آپؐ اس کے ذریعہ ان لوگوں کو بھی خبردار کریں جنہوں نے آپؐ سے ملاقات کی اور ان کو بھی خبردار کریں جنہوں نے ملاقات نہیں کی، لیکن قرآن ان تک پہنچ گیا۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ آخری پیغمبر ہیں اور قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ قیامت تک اس کی تعلیم اور تلاوت باقی رہے گی اور لوگوں پر اس کا اتباع لازم رہے گا۔ (معارف القرآن) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس تک میرا قرآن پہنچا تو گویا میں نے خود اسے تبلیغ کر دی۔ (ابن کثیر) اس پس منظر میں رسول اللہ ﷺ کے اس حکم کی گہرائی اور گیرائی کو سمجھنے کی کوشش کریں جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگ میری طرف سے پہنچاؤ خواہ ایک ہی آیت ہو۔

نوٹ۲: زیرِ مطالعہ آیت ۲۳ میں کچھ لوگوں کا ذکر ہے جو قسم کھائیں گے کہ ہم شرک نہیں کرتے تھے۔ ان کے لیے تفسیر بحرِ محیط اور مظہری میں ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جو کھلے طور پر کسی کو خدا نہیں کہتے تھے مگر ان کا عمل یہ تھا کہ خدائی کے اختیارات مخلوق کو بانٹ رکھے تھے، انہی سے روزی، صحت، اولاد اور ساری مرادیں مانگا کرتے تھے اور انہی کے نام کی نذر و نیاز کرتے تھے اور اپنے آپ کو مشرک نہ سمجھتے تھے، اس لیے میدانِ حشر میں بھی قسم کھا کر کہیں گے کہ ہم مشرک نہ تھے۔ (معارف القرآن) ۞۞۞

اسلامی برادری کے باہمی تعلقات

مدرّس: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنْ اَنَسٍ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ :

((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَا یُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ)) (۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''قسم اس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے' کوئی بندہ سچا مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے وہی نہ چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہو۔''

اس حدیث کے راوی حضرت انس رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں۔ آپؓ کے والد کا نام مالک ہے جس نے اسلام قبول نہ کیا' جبکہ آپ کی والدہ اُمِّ سُلَیم ایمان لائیں اور ہجرت کے بعد آپؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دے دیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک آپؐ کی خدمت کی اور خادمِ رسولؐ کے نام سے مشہور ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے نتیجے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ نے سو سال سے زیادہ عمر پائی۔ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے مگر اس وقت کم عمری کی وجہ سے جنگ میں حصہ نہ لیا۔ آپؓ سے ۲۲۸۶ احادیث مروی ہیں اور آپؓ وفات پانے والے سب سے آخری صحابی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جامع الکلم تھے' یعنی آپؐ کی گفتگو مختصر مگر نہایت معنی خیز ہوتی تھی۔ آپؐ کی باتوں پر ''دریا کو کوزے میں بند کرنا'' والا محاورہ یقینی طور پر صادق آتا ہے۔ زیر درس حدیث بھی جوامع الکلم کی ایک مثال ہے۔ اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر ایک اصولی بات بتادی کہ کوئی بندہ اس وقت تک ایمان والا نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی چیز پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ گویا مؤمن وہ ہے کہ جن جن چیزوں کو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے دوسرے مسلمانوں کے لیے بھی وہی پسند کرے۔ اس جامع تعلیم میں اخلاقیات کے سارے سبق سمو دیے گئے ہیں۔ مسلمان کو چاہیے کہ ہر برائی سے جہاں خود محفوظ رہنے کی کوشش کرے دوسرے مسلمانوں کے حق میں بھی اسے ناپسند کرے اور ہر اچھائی خود بھی اختیار کرے اور دوسروں کے لیے بھی پسند کرے۔ یہی مطلب ہے اس حدیث کا کہ ''مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں''۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ اسے کسی کے ہاتھ یا زبان سے تکلیف نہ پہنچے' پس اسے چاہیے کہ وہ کسی دوسرے کو بھی اپنے ہاتھ اور زبان سے تکلیف نہ دے بلکہ اگر کسی مسلمان بھائی کو کسی دوسرے شخص سے تکلیف پہنچ رہی ہو تو

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب من الایمان ان یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب الدلیل علی ان من خصال الایمان ان یحب لاخیہ ..... واللفظ لہ۔

اس کے ازالے کے لیے کوشش کرے۔ ہر مسلمان چاہتا ہے کہ اس سے کوئی غلطی یا خطا ہو جائے تو اسے معاف کر دیا جائے' چنانچہ دوسروں کو بھی ان کی غلطی پر معاف کر دینا چاہیے کہ ان کو بھی معافی پسند ہے۔ پھر دنیا میں لوگوں کو معاف کرنے والا قیامت کے دن اللہ کی مغفرت حاصل کرے گا' جس سے بڑھ کر اور کیا نعمت ہو سکتی ہے!

کہتے ہیں کہ پہلی امتوں میں ایک مفلس آدمی تھا' اس کا دل چاہا کہ کسی دن گوشت کھائے۔ چنانچہ اس نے کئی دن بچت کی اور ایک دن گوشت خرید لایا۔ بیوی کو دیا کہ اسے پکائے۔ دوپہر کو کھانے کے وقت گھر آیا تو خوش ہو رہا تھا کہ آج گوشت کے سالن کے ساتھ روٹی ملے گی۔ جب اس کے سامنے کھانا رکھا گیا اور وہ کھانے لگا تو دیکھا کہ سالن میں نمک اس قدر زیادہ ہے کہ وہ کھانے کے قابل نہیں۔ اس شخص کو اپنی بیوی پر بہت غصہ آیا۔ اس نے سوچا کہ میں غصے میں آ کر اس کو سزا تو دے سکتا ہوں لیکن اس سے غلطی ہو گئی اور غلطی تو ہر کسی سے ہو سکتی ہے۔ میری بھی غلطیاں ہیں جن کی معافی مجھے پسند ہے' چنانچہ اس نے غصہ پی لیا اور بیوی کو کچھ نہ کہا۔ وہ فوت ہو گیا تو کسی دوست کو خواب میں ملا۔ دوست نے پوچھا: تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ کہنے لگا: اللہ نے مجھے یہ کہہ کر معاف کر دیا کہ تو نے میری ایک بندی کی خطا معاف کی تھی' جبکہ میں تو غفورٌ رحیم ہوں' جا تجھے معاف کیا!

ہر کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ وہ انتظار کی زحمت سے بچا رہے' اگر کوئی اس کے ساتھ وعدہ کرے تو اس کو پورا کرے۔ پس ہر شخص کو چاہیے کہ وہ کسی کے ساتھ وعدہ کرے تو اس کو وفا کرے' دوسرے بندے کو انتظار کی زحمت میں نہ ڈالے۔ ایک شخص راستے سے گزرا تو دیکھا کہ درخت کی ایک شاخ آنے جانے والوں کے لیے پریشانی کا باعث بن رہی ہے۔ اُس نے سوچا کہ میں اُس کو ضرور راستے سے ہٹاؤں گا۔ چنانچہ اس نے محنت کر کے اس ٹہنی کو کاٹ کر گزرنے والوں کے لیے رکاوٹ دور کر دی۔ اس کے اس کام سے اللہ عزوجل اس قدر راضی ہوئے کہ اس کی بخشش کر دی۔ (معارف الحدیث' ج ۴' ص ۴۹)

آج آپ دیکھتے ہیں کہ مختلف قسم کے احتجاجی و سیاسی جلوس سڑکوں پر نکلتے ہیں۔ اس کے علاوہ دین سے محبت رکھنے والے بھی جلوس نکالتے ہیں جس کی قیادت مذہبی علماء کرتے ہیں۔ یہ جلوس جان بوجھ کر راستہ روک دیتے ہیں اور اسے اپنی اہمیت سمجھتے ہیں' مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ یہ کتنا بڑا گناہ ہے۔ جب راستہ کی رکاوٹ دور کرنا اتنی بڑی نیکی ہے کہ اس سے مغفرت ہو سکتی ہے تو راستہ روکنا اور چلنے والوں کے لیے رکاوٹ پیدا کرنا کتنا بڑا گناہ ہوگا۔

اسی طرح کوئی شخص نہیں چاہتا کہ اسے خالص چیز نہ ملے تو بازار میں بکنے والی ناخالص چیزیں دودھ' دیسی گھی' شہد' پسی ہوئی مرچیں وغیرہ کون تیار کرتے ہیں؟ ایسے لوگوں کو شاید معلوم نہیں کہ یہ کتنا بڑا جرم ہے' جبکہ خود ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ انہیں استعمال کرنے کے لیے خالص چیزیں ملیں۔

زیر درس حدیث کے اندر ایک اخلاقی ضابطہ بتا دیا گیا ہے کہ ہر مسلمان اپنے کردار کا جائزہ لے کہ دوسروں کے لیے تکلیف تو نہیں پیدا کر رہا۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہم سے کوئی شخص اپنی ضرورت کے لیے قرض لے اور اپنے وعدے کے مطابق وسائل ہونے کے باوجود واپس نہ کرے۔ پس ہمیں بھی اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ جس نے ہماری شدید ضرورت کے وقت قرض دیا اس کو بروقت واپس کریں۔ اگر کسی وجہ سے وقت پر واپس نہ کر سکیں تو معذرت کے انداز میں اسے مطمئن کریں کہ میں بہت جلد واپس کرنے کی کوشش کروں گا۔ (باقی صفحہ 57 پر)

اسلامی نظریہ حیات(۱)

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر☆

اسلامی نظریہ حیات ہی وہ واحد نظریہ ہے کہ جس میں انسانی زندگی کی ابتداء وانتہاء (Alpha and Omega)، مقصد زندگی، طرزِ حیات، تاریخ، لسانیات (Linguistics)، علمیت (Epistemology) اور اخلاقیات وغیرہ کے بارے میں اس قدر تفصیلی اور واقعی معلومات موجود ہیں کہ اس پر "Theory of Everything" کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ اس تحقیقی مضمون میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اسلامی ضابطہ حیات کی روشنی میں اسلام کا عالمی نقطہ نظر (world view) اصولی انداز میں اس طرح پیش کر دیا جائے کہ یہ دین کی روایتی فکر کا ایک جامع اور مختصر بیانیہ (narrative) بن جائے۔

اعتزال، جدیدیت، مابعد جدیدیت، دہریت، خوارجیت اور انتہا پسندی کے عوامل کے نتیجے میں پچھلے دس سالوں میں دورِ جدید کے علمی وفکری فتنوں کو گہرائی میں پڑھنے سننے کا موقع ملا کہ جس سے عقیدہ کا جدید اسلوب میں ایک ایسا مختصر اور جامع متن تیار کرنے کا جذبہ پیدا ہوا کہ جس میں ان فتنوں کا بھرپور استدلالی جواب موجود ہو۔ معلوم نہیں یہ مقصد کس حد تک پورا ہو پایا ہے؟ لیکن مصنف نے اس کے لیے محنت ضرور کی ہے کہ جس کا احساس اس مضمون کے مطالعے کے بعد ان لوگوں کو ضرور ہوگا جو ان فتنوں اور ان کے پیدا ہونے والے اثرات سے بخوبی آگاہ ہیں۔

اس بیانیے کا ہر ہر جملہ ایک ایسی فکر کا حامل ہے کہ جس میں کسی فتنے کا رد موجود ہے یا کسی اہم سوال کا جواب پوشیدہ ہے۔ اور متن کا ہر جملہ دوسرے کے ساتھ نہ صرف لفظاً ومعناً مربوط ہے بلکہ اس کے لیے ایک دلیل بھی ہے۔ بیانیے کا متن اگرچہ مختصر ہے لیکن حواشی میں بیانیہ کی دلیل اور استدلال تفصیل کے ساتھ کتاب وسنت سے نقل کر دیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر اہلِ علم کی آراء بھی منقول ہیں لیکن ان کا عربی سے اردو ترجمہ نہیں کیا گیا، نہ ہی دلالت کی نوعیت کو واضح کیا گیا ہے، جبکہ بعض مقامات پر محض اشارات کر دیے گئے ہیں تاکہ اہلیت نہ رکھنے والے افراد بحث کو اس کے علمی معیار سے نیچے نہ لاسکیں۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ اہلِ مغرب نے اپنے ہر علم، خواہ وہ سائنسی ہو یا سماجی، تاریخی ہو یا لسانی، کو نظریہ ارتقاء (theory of evolution) کی روشنی میں مرتب کر کے دکھا دیا ہے، جبکہ اہل مشرق پر یہ فرض ہے کہ وہ ہر علم کو، چاہے وہ تاریخ ہو یا سائنس، نظریہ تخلیق کی روشنی میں مرتب کر کے دکھا دیں۔ اور جب تک ہمارے محققین فلسفہ، سائیکالوجی، بیالوجی، نظریاتی فزکس، عمرانیات، لسانیات اور تاریخ کے مضامین میں نظریہ تخلیق (creationism)

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، کامسائٹس انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، لاہور۔ ای میل: mzubair@ciitlahore.edu.pk

کی روشنی میں بحث وتحقیق کی بنیاد نہیں رکھ دیتے' اس وقت تک دنیاوی علوم سے مذہب کا مقدمہ ثابت کرنا ممکن نہیں ہے۔

مابعد جدیدیت (postmodernism) کی یہ خوبی ہے کہ اس نے فلسفہ' ادب' معاشیات' لسانیات اور تاریخ وغیرہ کو اپنے نقطہ نظر سے نہ صرف نئے سرے سے بیان کر دیا بلکہ اپنا میوزک اور آرٹ بھی پیدا کر کے دکھا دیا' جبکہ اہل مذہب کو تو نئے سرے سے کچھ بھی تخلیق کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف پہلے سے موجود کام کو مرتب کرنا ہے۔ مثلاً نظریہ تخلیق کی روشنی میں اگر آپ نے انسان کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ہے تو ''**تاريخ الرسل والملوك**'' اور ''**ديوان المبتدأ والخبر**'' کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اور اگر نظریہ تخلیق ہی کی روشنی میں معاشیات پر تحقیق کرنی ہے تو ''**الأموال**'' اور ''**الخراج**'' کو دیکھ لیں۔ خوارزمی نے وراثت کے مسائل حل کرنے کے لیے الجبرا (Algebra) ایجاد کیا اور اس بارے میں اس کی کتاب ''**الكتاب المختصر في حساب الجبر والمقابلة**'' کا آخری باب دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کیا ''خطاطی'' (Calligraphy) آرٹ میں اور ''مقامات'' (Quranic Rhythms) میوزک کے بالمقابل ایسے اسلامی فنون نہیں ہیں جو انسان کی آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو حقیقی سکون بخشیں؟

اردو اور انگریزی حواشی کو بعینہٖ نقل کیا گیا ہے جبکہ عربی حواشی کی طوالت کی وجہ سے محض حوالہ کے بیان پر اکتفا کیا گیا ہے۔ میں اپنی یونیورسٹی کے ان جمیع ڈاکٹر صاحبان کا بھی شکر گزار ہوں' خاص طور فزکس اور ریاضی کے' کہ جنہوں نے اس کتاب میں شامل بعض موضوعات پر گفت وشنید کے لیے وقت نکالا۔

خالق اور مخلوق دونوں حقیقت ہیں[۲]۔ دہریت (atheism) علماً اندھا ایمان[۳] (blind faith) اور منہجاً سوفسطائیت[۴] (sophism) ہے' جبکہ ''تنزلات''[۵] جہلِ مرکب[۶] اور بدعت[۷] ہیں۔

(۱) مبدأ اور معاد (Entry and Exit)

انسان کے مبدأ اور معاد کے بارے میں سب سے جامع اور منطقی جواب مذہب کے پاس ہے[۸]۔ ازل سے خالق تھا اور اس کے ساتھ کچھ بھی نہ تھا' یہاں تک کہ اُس نے سب سے پہلے پانی کو پیدا کیا اور اس کے بعد اس پر اپنا عرش بنایا[۹]۔ پانی اور عرش کے بعد سب سے پہلے جسے خالق نے پیدا کیا' وہ قلم ہے۔ اور اسے پیدا کرنے کے بعد خالق نے اسے قیامت تک جو کچھ ہونے والا تھا' اس کے لکھنے کا حکم دیا۔ اور اس لکھے ہوئے کو ہم تقدیر کے نام سے جانتے ہیں[۱۰]۔ اس کے بعد خالق نے زمین' پہاڑوں' سات آسمانوں' ستاروں اور دیگر مخلوقات کو چھ دنوں میں پیدا کیا[۱۱] اور اپنے عرش پر مستوی ہوا[۱۲]۔ خالق اور مخلوق کا باہمی تعلق اصلاً عبد ومعبود کا ہے نہ کہ وہم وخیال یا عکس وظلال کا۔

اس دنیا میں انسان کا وجود کسی اتفاق (chance) یا حادثے (accident) کا نتیجہ نہیں بلکہ خالق وحدہ لاشریک کی ایک بامقصد تخلیق کا ظہور ہے[۱۴]۔ اور انسان کی پیدائش کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی عبادت

اور بہترین عمل کے ذریعے اپنے خالق کا شکر ادا کرے[۱۵]۔ کائنات کے خالق نے مادہ نور سے فرشتوں، آگ سے جنات اور مٹی سے انسان کی تخلیق کی[۱۶]۔ اُس نے فرشتوں اور جنّات کی تخلیق کے بعد ایک تیسری مخلوق انسان کو پیدا کرنے اور اسے زمین میں خلیفہ[۱۷] اور مسجودِ ملائک بنانے کا اعلان کیا[۱۸]۔ اور زمین کی مٹھی بھر مٹی[۱۹] کے گارے کا جوہر[۲۰] لے کر اپنے دونوں ہاتھوں سے[۲۱] پہلے انسان [آدم] کا پُتلا (statue) بنایا اور اسے جنت میں رکھا[۲۲]۔ اس کی نوک پلک سنوارنے کے بعد اس میں اپنی روح پھونکی[۲۳] اسے خلیفہ ہونے کے مقام پر سرفراز کرنے کا اعلان فرمایا[۲۴] اور مسجودِ ملائک ٹھہرایا[۲۵]۔ فرشتوں نے سجدہ کر کے آدم کے عالی مقام کو قبول کیا جبکہ جنات میں سے ابلیس نے آدم کے مرتبے سے حسد کیا اور اللہ کے دربار میں تکبر کا اظہار کرتے ہوئے نہ صرف سجدہ کرنے سے انکار کر دیا بلکہ آدم اور ان کی ذریت کے خلاف ابدی دشمنی کا بھی اعلان کر دیا۔[۲۶]

خالق نے آدم علیہ السلام کی پسلی ہی سے ان کے لیے جنس مخالف حوا کا جوڑا پیدا کیا اور پھر اس زمین میں ان دونوں سے کثیر تعداد میں نسل انسانی کو پھیلا دیا[۲۷]۔ مخلوقات کی پیدائش کے بعد ان کی افزائش نسل کے لیے خالق نے ہر جاندار شے میں اصل ''پانی'' کو بنایا[۲۸]۔ شروع میں آدم اور حوا دونوں کو آسمانوں کی جنت میں رکھا گیا[۲۹] جبکہ بعد ازاں اسی جنت کے حصول کے لیے امتحان کی غرض سے متعین مدت کے لیے زمین پر اتارا گیا[۳۰] اور ایک ''آسمانی ضابطہ حیات'' عطا کیا گیا کہ جس کے مطابق زندگی گزارنے کو دنیاوی امتحان میں کامیابی کی شرط لازم قرار دیا گیا[۳۱]۔ دنیا کے امتحان میں کامیابی اور ناکامی کے اعلان کے لیے آخرت کا دن مقرر کیا گیا اور کامیاب لوگوں کے لیے ہمیشہ کی جنت کا وعدہ اور ناکام لوگوں کے لیے جہنم کی وعید سنائی گئی۔[۳۲]

قدیم انسان کی تاریخ پانچ ادوار میں منقسم ہے[۳۳]۔ پہلا دور آدم سے نوح، دوسرا نوح سے ابراہیم، تیسرا ابراہیم سے موسیٰ، چوتھا موسیٰ سے عیسیٰ (علیہم السلام) اور پانچواں عیسیٰؑ سے محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ہے[۳۴]۔ آدم کو آسمانوں کی جنت[۳۵] سے ''ارضِ ہند'' میں اتارا گیا[۳۶] اور انہیں صنعت[۳۷] اور زبان[۳۸] دونوں سکھا کر دنیا میں بھیجا گیا۔ میدانِ عرفات میں ''عہدِ الست'' ہوا[۳۹] اور آدم کی اولاد ''مشرق'' میں ''شام'' (Mesopotemia) میں آباد ہوئی۔[۴۰]

آدم اور نوح (علیہما السلام) کے مابین دس نسلیں[۴۱] ہیں جو ''توحید'' پر ایمان رکھنے والی تھیں[۴۲]۔ آدمؑ کی اولاد میں پہلی مرتبہ ''شرک'' کا ظہور نوحؑ کے زمانے میں ہوا[۴۳] جبکہ وہ ''شام'' (Mesopotemia) کے علاقے میں آباد تھے۔ قوم نوحؑ کے شرک، سرکشی اور بغاوت کے نتیجے میں ''طوفانِ نوح'' کے ذریعے نسل انسانی ہلاک ہوئی اور اہل کشتی میں سے صرف نوحؑ ہی کی نسل آگے جاری ہوئی[۴۵]۔ موجودہ نسل انسانی نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں سام، حام اور یافث کی اولاد ہے[۴۶]۔ عرب سام، حبشی حام اور اہل روم یافث کی اولاد ہیں[۴۷]۔

نوح اور ابراہیم (علیہما السلام) کے مابین بھی دس نسلیں ہی ہیں[۴۸]۔ ''قومِ نوح'' کی ہلاکت کے بعد ''قومِ عاد'' ان کی جانشین بنی[۴۹]۔ ''قومِ عاد'' کی ہلاکت کے بعد ''قومِ ثمود'' ان کی جانشین ٹھہری[۵۰]۔ ''قوم ثمود'' کی ہلاکت کے بعد ''قومِ ابراہیم''، ''قومِ لوط'' اور ''قومِ شعیب'' ان کی جانشین قرار پائیں[۵۱]۔ ابراہیم علیہ السلام

کی بعثت کے بعد نبوت ان ہی کی ذریت میں رکھ دی گئی (۵۲)۔ابراہیم سے موسیٰ اور موسیٰ سے عیسیٰ (علیہم السلام) تک ''نبوت اور کتاب'' بنواسحاق کے پاس رہی (۵۳) اور محمدؐ رسول اللہ ﷺ سے بنواسماعیل کو منتقل ہوگئی (۵۴)۔اور محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے جدید انسان (modern age) کی تاریخ کی ابتداء ہوئی۔

یہ اس دنیا کی ابتداء اور انتہاء ہے۔پس سائنسی' انسانی اور عمرانی علوم (Humanities and Social Sciences) میں ہر وہ نقطہ نظر (world view) کہ جس کی بنیاد اصولِ ثلاثہ ''توحید''، ''رسالت'' اور ''آخرت'' نہ ہو' ظلمت ہے (۵۵) اور ہر وہ علم کہ جس کا معلوم ''اصولِ ثلاثہ'' کا انکار ہو' جاہلیت ہے (۵۶)۔

(۲) روایت اور فہم (Tradition and Hermeneutic)

خالق کی طرف سے دنیاوی زندگی گزارنے کے لیے نازل کیے گئے ابدی اور آسمانی ضابطہ حیات کو ''دین اسلام'' کا نام دیا گیا (۵۷) اور اس کے علاوہ کسی بھی ضابطہ حیات کو قبول کرنے یا اس کے مطابق زندگی گزارنے کا انکار کر دیا گیا (۵۸)۔ہر قوم کی طرف نبی اور رسول بھیجے گئے (۵۹)۔آدم علیہ السلام سے لے کر محمد ﷺ تک تمام انبیاء کا ضابطہ حیات ایک ہی تھا اور وہ ''اسلام'' ہے' اگرچہ اس ضابطہ حیات کی تشریحات اور توضیحات کہ جسے ''شریعت'' کہتے ہیں' احوال وظروف میں تبدیلی کی وجہ سے مختلف ادوار اور اقوام میں متنوّع رہی ہیں (۶۰)۔شریعت یعنی ضابطہ حیات کی تفصیلات اور جزئیات (code of life) کی طرح منہاج یعنی شریعت کو فرد ومعاشرے میں جاری وساری کرنے کا طریق کار (way of life) بھی ہر قوم کے لیے مختلف رہا ہے (۶۱)۔محمد ﷺ کی بعثت کے بعد قیامت تک کے لیے اللہ کا دین اسلام' شریعت محمدی اور منہاج دعوت وجہاد ہے (۶۲)۔اور اب ان تینوں پر عرفاً ''اسلام'' کے لفظ کا اطلاق درست ہے۔

اس دین کے دو پہلو ''روایت'' اور ''فہم'' ہیں۔جہاں تک ''دین کی روایت'' کی بحث ہے (۶۳) تو حصولِ علم کے ذرائع (means of knowledge) میں سے مستند ترین اور جامع ترین ذریعہ ''خبر'' ہے اور ''وحی'' خبر ہی کی ایک قسم ہے (۶۴)۔اگرچہ سابقہ آسمانی کتب میں آج بھی بعض مقامات پر اللہ کا حکم موجود ہے (۶۵) لیکن چونکہ ان قوموں نے اپنی الہامی کتب اور نبیوں کی تعلیمات میں اخفاء اور اضافے (۶۶) کے رستے لفظی ومعنوی تحریفات کر لی تھیں (۶۷) لہٰذا اب قیامت تک کے لیے' انسانوں کی اخروی نجات کی لازمی شرط' دینِ اسلام کو جاننے کا واحد محفوظ ذریعہ خالق کے آخری پیغمبر محمدؐ رسول اللہ ﷺ ہیں (۶۸)۔محمد ﷺ کی بعثت کے بعد گزشتہ پیغمبروں کی اقوام کے لیے آپ ﷺ اور قرآن مجید کی اتباع اُخروی نجات کی لازمی شرط ہے (۶۹) اور اللہ کے دین کو بیان کرنے میں آخری کتاب قرآن مجید سابقہ جمیع آسمانی صحائف پر نہ صرف حاکم ہے (۷۰) بلکہ ان کی ناسخ بھی ہے (۷۱)۔محمد رسول اللہ ﷺ سے یہ دین' قرآن مجید اور سنت نبوی دو صورتوں میں' بذریعہ خبر اس اُمت کو منتقل ہوا ہے اور ''خبر صحیح'' (۷۲) کے ذریعے اس دین کا محمدؐ رسول اللہ ﷺ سے امت کے کس فرد تک پہنچ جانا اس پر حجت قائم ہو جانے میں کافی ہے (۷۳)۔قرآن مجید کی خبر کا ثبوت ''اصولِ قراءات'' حدیث کا ''اصولِ حدیث''، تفسیری اقوال کا ''اصولِ تفسیر''، سیرت کا ''اصولِ سیرت'' اور تاریخ کا ''اصولِ تاریخ'' کی

روشنی میں طے ہوگا۔(۷۴)

اور رہی بات ''دین کے فہم'' کی تو لفظ و معنی کا تعلق لازم و ملزوم کا ہے' لہٰذا اس سے زیادہ لغو بات کوئی نہیں ہے کہ لفظ کا کوئی معنی نہیں ہوتا(۷۵)۔ زبان ابتداء میں ''توقیف''(۷۶) اور استعمال میں ''وضع'' ہے(۷۷)۔ اور قرآن مجید اور سنت نبوی دونوں وحی الٰہی ہیں اور دین اسلام کے بنیادی مصادر ہیں(۷۸) اور عقیدہ و عمل یا حلال و حرام کے بیان میں ان دونوں سے ایسی حجت قائم ہوتی ہے کہ جس کی بنیاد پر انسان آخرت میں مسئول قرار پائے(۷۹)۔ قرآن و سنت کا باہمی تعلق لفظ و معنی کا ہے(۸۰)۔ قرآن مجید اللہ کے الفاظ ہیں جبکہ سنت منشائے متکلّم کے مطابق ان کا بیان ہے(۸۱)۔ قرآن مجید میں الفاظ تلقی و تلاوت(۸۲) جبکہ سنت نبوی میں معنی تحمل و اداء(۸۳) کی صورت میں' قراءات اور حدیث کی اصطلاحات کے ساتھ' محمدٌ رسول اللہ ﷺ سے ہم تک نسل در نسل منتقل ہوا ہے۔ قرآن مجید روایت باللفظ ہے جبکہ حدیث کہیں روایت باللفظ اور کہیں روایت بالمعنی ہے(۸۴)۔ قرآن مجید یا حدیث نبوی کے فہم میں سلف صالحین کا منہج استدلال حجت (binding) ہے(۸۵) اور اگر نص کے کسی معنی پر مسلمان اہلِ علم کا اتفاق ہو جائے تو اس سے اختلاف گمراہی کا رستہ ہے(۸۶)۔ اجماع اور قیاس مظہر حکم ہیں نہ کہ مثبت شریعت(۸۷)۔ کلام میں اصل حقیقت ہے اور مجاز کے لیے قرینہ چاہیے(۸۸)۔ کلام کبھی محکم ہوتا ہے اور کبھی متشابہہ(۸۹) اور اس کی اپنے معنی پر دلالت کہیں قطعی ہے اور کہیں ظنی(۹۰)۔ نبی کریم ﷺ کی تفسیر اور اجتہاد دونوں حجت ہیں(۹۱) جبکہ مفسّر صحابہ کی ''درایت تفسیری'' حجت ہے(۹۲) جبکہ ''درایت اجتہادی'' حجت نہیں(۹۳)۔ اور فقہاء صحابہ کا اجتہاد اور فتویٰ معتبر ہے(۹۴)۔ خیر القرون میں ہی کتاب و سنت کے فہم کے دو اجتہادی مناہج دو مکاتب فکر' اہل الاثر اور اہل الرائے' کی صورت میں حجاز اور عراق میں وجود میں آئے(۹۵)۔ اہل الاثر کی ریاست امام مالک رحمہ اللہ اور اہل الرائے کی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے حصے میں آئی(۹۶)۔ اہل الاثر سے مالکی' شافعی' حنبلی اور ظاہری مکاتب فکر جبکہ اہل الرائے سے حنفی مکتبہ فکر کی ابتداء پڑی(۹۷)۔ اور عصر حاضر کے حالات و تقاضوں کے مطابق دین کی تعبیر و تشریح کے بیان میں کسی علمی روایت سے تمسّک ضروری ہے(۹۸) ورنہ تو ہر اس تعبیر دین یا بیانیے کی مثال ایک کٹی پتنگ کی سی ہوگی کہ جس کی سند دو چار واسطوں کے بعد منقطع ہو جاتی ہو(۹۹)۔ علماء کے لیے ''اجتہاد''(۱۰۰) جبکہ عوام کے لیے ''اتباع''(۱۰۱) واجب ہے۔(۱۰۲)

(۳) علم اور قوت (Power and Knowledge)

علم' توحید کی معرفت ہے(۱۰۳) اور جس کا نتیجہ توحید کا انکار ہو' وہ علم نہیں جہالت ہے(۱۰۴)۔ پیغمبروں کی بعثت کا مقصد خالق کے دیے ہوئے ضابطہ حیات کی نہ صرف تبلیغ تھی کہ فرد اپنے خالق کی بندگی اختیار کرے' طاغوت سے اجتناب کرے(۱۰۵) اور اس پر آخرت میں اس بارے مسئول (accountable) ہونے کے باب میں حجت قائم ہو(۱۰۶) بلکہ اس کا نفاذ بھی تھا تاکہ معاشرے سے ظلم کا خاتمہ ہو اور اس میں عدل کا نظام قائم ہو(۱۰۷)۔ لہٰذا دلیل اور قوت دونوں صورتوں میں پیغمبروں کا غلبہ مقصود رہا ہے۔(۱۰۸)

اللہ کے رسول ﷺ کی رسالت کے دو مقاصد تھے: تلاوتِ آیات اور تعلیم کتاب و سنت کے ذریعے فرد کا

تزکیہ نفس [۱۰۹] اور جہاد وقتال کے ذریعے بقیہ جمیع ادیان پر دین اسلام کا غلبہ [۱۱۰]۔ اللہ کے رسول ﷺ کی علمی وراثت' علماء [۱۱۱] اور خلافت' امراء کو منتقل ہوئی [۱۱۲]۔ اجتہاد اور جہاد دین کی دو بنیادی اصطلاحات ہیں اور اجتہاد کا مطلوب دلیل میں اسلام کا غلبہ [۱۱۳] ہے جبکہ جہاد کا مقصود قوت میں اسلام کو غالب کرنا ہے۔ [۱۱۴]

اور دین کی حفاظت اور فروغ کے دو ذرائع ہیں: علم [۱۱۵] اور قوت [۱۱۶]۔ خالق نے علم کے ذریعے دین کی حفاظت فرمائی [۱۱۷] اور قوت کے ذریعے اہلِ دین کی [۱۱۸]۔ دین کے فروغ کا منہج دعوت و جہاد ہے اور یہ دونوں قیامت تک جاری رہیں گے [۱۱۹]۔ اہلِ دین مغلوب ہوں تو دعوت و تبلیغ اصل منہج ہے [۱۲۰] اور اگر غالب ہوں تو مسلم معاشرے میں پیدا شدہ بگاڑ کی اصلاح کے لیے ہر مؤمن سے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا تقاضا ہے [۱۲۱] جبکہ غیر مسلم معاشروں کو مغلوب ومفتوح کرنے کے لیے جہاد وقتال کا' تاکہ اس کے نتیجے میں مخلوق کا مخلوق پر ظلم ختم ہو اور خالق کا عدل قائم ہو [۱۲۲]۔ معروف وہ ہے کہ جس کا شارع نے مطالبہ کیا ہو اور منکر وہ ہے کہ جس سے شارع نے منع کیا ہو [۱۲۳]۔ مسلمانوں کے لیے امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے [۱۲۴] جبکہ جہاد غیر مسلموں سے ہے' لہٰذا نہ تو مسلمانوں کی باہمی لڑائی جہاد ہے [۱۲۵] اور نہ ہی مسلمان حکمران کے خلاف خروج جائز ہے [۱۲۶]۔ مسلمانوں کا باہمی علمی وسیاسی افتراق وانتشار مذموم جبکہ اتفاق واتحاد مطلوب ہے' لہٰذا اجماع کے حصول اور ریاست ہائے متحدہ اسلامی کے قیام کے جدوجہد دین کا بنیادی تقاضا ہے۔ [۱۲۷]

حضرت آدم علیہ السلام کی خلافتِ ارضی اور آسمانوں سے نزول کے بعد اس کرۂ ارضی پر جب نسل انسانی کا آغاز ہوا [۱۲۸] تو سب انسان ایک ہی ضابطہ حیات اسلام کے پیرو تھے' جبکہ بعد ازاں اپنی خواہش نفس اور شیطان کے بہکاوے میں آ کر بعض انسانوں نے خالق کے دین سے اختلاف کا رستہ اختیار کیا [۱۲۹]۔ آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں میں جب کسی مسئلے میں باہمی اختلاف ہوا اور ایک نے غصے میں آ کر دوسرے کو قتل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو مقتول نے قتل کے فعل کو نہ صرف گناہ بلکہ جہنم میں داخلے کا سبب بھی قرار دیا [۱۳۰] کہ جس سے سورۃ البقرۃ کی آیت مبارکہ [۱۳۱] میں معہود ضابطہ حیات کی موجودگی اور اس سے انحراف کے نقطہ آغاز کا علم ہوتا ہے۔ [۱۳۲]

پس خالق نے اپنے ابدی ضابطہ حیات کی حفاظت اور فروغ کے لیے انبیاء ورسل کی بعثت اور آسمانی صحف وکتب کے نزول کا سلسلہ جاری فرمایا کہ جس کے دو مقاصد تھے: ایک مقصد تو انذار وتبشیر اور دعوت وتبلیغ کے رستے انسانوں کو خالق کے ضابطہ حیات کے بارے آگاہ کرنا اور دوسرا انسانوں کے باہمی اختلافات میں خالق کے حکم کے مطابق فیصلہ فرماتے ہوئے اس کے ابدی دین کو انسانی معاشروں میں جاری وساری کرنا [۱۳۳]۔ حضرت آدم علیہ السلام اسی معنی میں خالق کے نبی اور خلیفہ تھے [۱۳۴]۔ اور حضرت داؤد علیہ السلام کے بیان میں تو نص صریح موجود ہے کہ نبی کے خلیفہ ہونے سے خالق کی مراد یہ ہے کہ وہ خالق کے حکم کو اس کی مخلوق میں نافذ اور لاگو کریں۔ [۱۳۵]

پس خالق کی طرف سے پیغمبر دو حیثیتوں سے دنیا میں بھیجے جاتے تھے' ایک نبی اور دوسرا خلیفہ ہونے کی۔ پہلی حیثیت میں وہ خالق کے حکم کو اس کی مخلوق تک پہنچانے کے لیے واسطہ ہوتے ہیں جبکہ دوسری حیثیت میں وہ خالق کے حکم کو اس کی مخلوق کے مابین جاری وساری کرتے ہیں اور اللہ کے نبی محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نبوت

اگرچہ ختم ہوگئی لیکن علم میں وراثت اور قوت میں خلافت جاری ہے[۱۳۶]۔حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے اپنے آپ کو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا خلیفہ قرار دیا[۱۳۷]۔ان کے بعد صحابہؓ نے حضرت عمر ؓ کو حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا خلیفہ قرار دیا[۱۳۸]۔پس خلافت اللہ کے نبی ﷺ سے خلفائے راشدین (632-661) کو منتقل ہوئی اور یہ دورِ خلافت' نبوت کے منہاج پر قائم تھا۔[۱۳۹]

خلافت راشدہ سے یہ خلافت بنواُمیہ (661-750) کو منتقل ہوئی' جبکہ اس میں ملوکیت کی بھی آمیزش ہو چکی تھی۔ملوکیت کی آمیزش کے باوجود نبی کریم ﷺ نے بنواُمیہ کے حکمرانوں کو خلفاء قرار دیا کیونکہ وہ خلیفہ کے منصب پر فائز تھے[۱۴۰]۔بنواُمیہ (661-750) سے یہ خلافت بنوعباس (750-1517) نے اور ان سے عثمانی ترکوں (1517-1924) نے بزورِ شمشیر حاصل کی[۱۴۱]۔1924ء میں انگریزوں کی سازش کے سبب سے خلافت کا ادارہ ختم کر دیا گیا اور اس وقت سے اُمتِ مسلمہ میں اس ادارے کی بحالی کے لیے اسلامی تحریکیں برپا ہونا شروع ہوئیں۔

جس طرح ابتداء میں حضرت آدم ؑ کی خلافتِ ارضی میں تمام انسان ایک ہی دین پر تھے' بالکل اسی طرح انتہاء میں حضرت عیسیٰ ؑ کی خلافتِ ارضی میں تمام انسان ایک ہی دین پر ہوں گے[۱۴۲]۔ بہرحال یہ تو خالق کا ''تکوینی امر'' ہے جو پورا ہو کر رہنے والا ہے جبکہ ''امرِ شرعی'' یہ ہے کہ ابتداء اور انتہاء کے درمیان کی مدت میں خالق کے مؤمن بندے خالق کے دین کی حفاظت' فروغ اور غلبہ کے لیے دعوت و جہاد کا کام کریں[۱۴۳]۔اللہ عزوجل اس دنیا میں اپنے بندوں پر ''حجت'' قائم کرتے ہیں تاکہ قیامت والے دن ان کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہے[۱۴۴]۔یہ حجت دو طرح سے قائم ہوتی ہے' ایک رسول کی دعوت سے اور دوسرا خالق کی کتاب سے[۱۴۵]۔محمدؐ رسول اللہ ﷺ چونکہ آخری نبی ہیں' لہٰذا آپ ﷺ کی رحلت کے بعد قیامت تک کے لیے خالق کے بندوں پر خالق کی کتاب کو ''حجت'' بنایا گیا۔[۱۴۶]

مشرکین ہوں یا اہلِ کتاب' دونوں کے بارے میں اللہ کی کتاب کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ یا تو اسلام قبول کریں یا پھر جزیہ دے کر رہیں[۱۴۷]۔اللہ کے رسول ﷺ مشرکین عرب کے مقابلہ کے لیے جب بھی صحابہ کرام ؓ کا کوئی لشکر روانہ کرتے تھے تو انہیں تین چیزوں اسلام' جزیہ یا قتال کی دعوت دینے کی نصیحت فرماتے[۱۴۸]۔ مشرکین اور اہلِ کتاب کو مفتوح و مغلوب کرنے کی غرض سے ''جہاد کا حکم'' قیامت تک کے لیے باقی ہے[۱۴۹] جبکہ ان پر جزیہ عائد کرنے کا حکم نزولِ مسیح ابن مریم ؑ تک قائم رہے گا۔[۱۵۰]

جہاد و قتال کی حکمت اسلام میں ایک ہی ہے اور وہ ''ظلم و عدوان'' کا خاتمہ ہے[۱۵۱]۔اور اس کی دلیل نص صریح ہے[۱۵۲]۔قرآن مجید میں بظاہر جن منضبط اوصاف کی بنیاد پر جہاد و قتال کا حکم دیا گیا ہے وہ دراصل ''ظلم و عدوان'' ہی کی صورتیں ہیں۔اسلام ''ظلم و عدوان'' کی کسی صورت کو کسی طور برداشت نہیں کرتا' چاہے اہل ایمان پر ہو خواہ انسانوں پر ہو۔یہی وجہ ہے کہ اللہ عزوجل نے ''ظلم و عدوان'' کے خاتمہ کے لیے ظالموں کے خلاف قتال کو مشروع قرار دیا ہے' چاہے وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔[۱۵۳]

اب اگر سوال یہ ہو کہ اللہ کے رسول ﷺ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں مشرکینِ عرب‘ یہود عرب‘ اہل فارس اور اہل روم سے جہاد وقتال کیوں ہوا؟ اور اگر ’’اتمامِ حجت‘‘ وجہ نہیں تھی (۱۵۴) تو اس جہاد و قتال کی کیا وجہ تھی؟ تو اس جہاد وقتال کی ایک ہی وجہ ہے اور وہ ’’ظلم وعدوان‘‘ ہے‘ جیسا کہ ہم بیان کر چکے‘ چاہے یہ ظلم ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر کرے یا ایک انسان دوسرے انسان پر کرے۔ آپ ﷺ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں مشرکین عرب‘ اہل کتاب اور اہل فارس نے اپنے مذہبی عقائد کی روشنی میں جو ایک ظالمانہ اور استحصالی اجتماعی یا ریاستی نظام قائم کر رکھا تھا‘ دراصل اس ظالم اور استحصالی ریاست کے خلاف جہاد وقتال کیا گیا ہے (۱۵۵)۔ پس ایک اسلامی ریاست کی اقوام عالم کے حوالہ سے دو خارجی ذمہ داریاں ہیں: ایک عالم دنیا تک پیغام رسالت کو پہنچانا اور دوسرا عالم دنیا سے ظلم کا خاتمہ۔ پہلی ذمہ داری کے لیے دعوت وتبلیغ کے عمل کو ریاست کی سرپرستی حاصل ہوگی‘ جبکہ دوسری کے لیے جہاد وقتال کو ریاست کی بنیادی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے (۱۵۶) بشرطیکہ ریاست اس کی اہلیت رکھتی ہو اور خارج میں حالات اس کی اجازت دیتے ہوں۔

(۴) ایمان اور اخلاق (Belief and Ethics)

اسلام دین فطرت ہے کہ ہر بچہ مسلمان پیدا ہوتا ہے اور اس کے والدین اسے یہودی‘ عیسائی یا مجوسی وغیرہ بنا دیتے ہیں (۱۵۷)۔ ایمان محض اندھے یقین (blind faith) کا نام نہیں بلکہ ایک تجربہ (experiment) ہے۔

مخلوق کافر اور مؤمن میں تقسیم ہے (۱۵۸)۔ خالق کی نظر میں کافر اور مؤمن برابر نہیں ہیں (۱۵۹)۔ اس کی نظر میں کافر بدترین انسان اور مؤمن بہترین انسان ہیں (۱۶۰)۔ کافر حربی کا حکم قتل (۱۶۱)‘ ذِمّی کا جزیہ (۱۶۲)‘ مستامن کا امن (۱۶۳) اور معاہد کا صلح (۱۶۴) ہے۔ مومن کے لیے کافر سے تعلق ولایت حرام (۱۶۵) جبکہ تقیہ (۱۶۶)‘ انصاف (۱۶۷)‘ حسن سلوک (۱۶۸) اور معاملہ (۱۶۹) جائز ہے۔ اسلامی ریاست میں مؤمن اور کافر کے حقوق برابر نہیں ہیں۔ (۱۷۰)

دینِ فطرت میں ’’اسلام‘‘ ظاہر‘‘ ’’ایمان‘‘ باطن اور ’’احسان‘‘ دونوں کی تکمیل کا نام ہے (۱۷۱)۔ اسلام میں داخل ہونے کے لیے کلمہ شہادت کا اقرار ضروری ہے (۱۷۲) جبکہ کفر اکبر یا شرکِ اکبر کے ارتکاب سے ایک شخص دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے (۱۷۳)۔ کسی کلمہ گو کی ’’تکفیر‘‘ گناہِ کبیرہ ہے (۱۷۴) اور معین کی تکفیر اس وقت جائز ہوگی جبکہ کبار اور عادل اہلِ علم کی جماعت کا اس پر اتفاق ہو جائے (۱۷۵)۔ ’’کفر دون کفر‘‘ گناہ کبیرہ ہے نہ کہ ’’خارج عن الملة‘‘ (۱۷۶)۔ ایک شخص میں اسلام وکفر (۱۷۷)‘ ایمان ونفاق (۱۷۸) اور اطاعت ومعصیت جمع ہو سکتے ہیں۔ (۱۷۹)

عمل سے ایمان میں کمی بیشی ہونا حق ہے (۱۸۰)۔ اور ہم معین شخص کے بارے میں نہ جنت کی شہادت دے سکتے ہیں اور نہ ہی جہنم کی گواہی (۱۸۱)۔ جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا وہ جنت میں ضرور داخل ہوگا اور جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جہنم میں ضرور داخل ہوگا۔ (۱۸۲)

اخلاق انسان کی باطنی صورت ہے کہ اچھی ہو تو اسے حسنِ خلق کہتے ہیں۔ افعال کا حسن وقبح عقلی ہے (۱۸۳)

(باقی صفحہ 76 پر)

احکامِ شریعہ میں حالات وزمانہ کی رعایت

(مولانا محمد تقی امینی کے افکار کا خصوصی مطالعہ)

پروفیسر محمد انس حسان ☆

دورِ حاضر میں جن اسلامی ممالک میں ایک سنجیدہ علمی طبقہ اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے سرگرمِ عمل ہے' ان کے سامنے ایک مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کرتا جارہا ہے کہ جن سیاسی' معاشی اور معاشرتی مسائل میں قرآن وسنت اور فقہاءِ کرام کے اجماع کی شکل میں صریح ہدایات موجود ہیں ان کو من وعن تسلیم کرلیا جائے یا حالات وزمانہ کے اعتبار سے ان میں مناسب ترمیم واضافہ کی گنجائش موجود ہے۔

تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ یہ کہتا ہے کہ کتاب وسنت کے تمام احکام ابدی اور دائمی ہیں' ان میں کسی ترمیم واضافہ کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے برخلاف تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا طبقہ' جس میں زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ اور کچھ روشن خیال علماء شامل ہیں' یہ کہتا ہے کہ اسلام نے سیاست' معیشت اور معاشرت میں جو حدیں مقرر کی ہیں' ان کو حالات اور ماحول کے تقاضے کے تحت بدلا اور توڑا جاسکتا ہے۔ اس حلقہ میں کچھ لوگ تو واقعی اخلاص سے یہی رائے رکھتے ہیں مگر ان میں بیشتر یا تو مغربی نظام کی مرعوبیت کی بنا پر ایسا کہتے ہیں یا پھر اپنی کم علمی اور آزادانہ روی کی وجہ سے ایسا چاہتے ہیں۔ (۱)

اگر حقیقت بین نظروں سے دیکھا جائے تو دونوں طبقات افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ پہلا طبقہ اسلام کے ارتقائی فکر میں جمود کا باعث بن رہا ہے تو دوسرا طبقہ مغربی فکر کے زیر اثر اسلام کا ایک بالکل نیا ورژن پیش کررہا ہے۔ ظاہر ہے کہ فکری نقطہ نظر سے یہ دونوں طبقات اسلام کو فائدہ پہنچانے کی بجائے نقصان پہنچانے کا باعث بن رہے ہیں۔ یقیناً موجودہ دور کے کئی مسائل اپنے تنوع کے اعتبار سے ایسے ہیں جن میں حالات وزمانہ کی رعایت ناگزیر ہوگی اور ایک صحیح اسلامی نظامِ حکومت کو اس اصول سے گوناگوں استفادہ کرنا پڑے گا' لیکن اس امر میں اس بات کا خاص لحاظ رکھنا بھی ضروری ہوگا کہ انہی امور میں اس رعایت سے استفادہ کیا جائے جو نبی کریم ﷺ کے مخصوصات یا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عمل سے ثابت ہوں اور کسی بھی ایسے کام میں رائے زنی سے کام نہ لیا جائے جو ان اصولوں کے برخلاف ہو۔ اس حوالے سے یہ تیسرا طبقہ ہوگا جو درج بالا دونوں طبقات کا درمیانہ طبقہ ہے اور راہ اعتدال کی دعوت دیتا ہے۔

مولانا محمد تقی امینی (۱۹۲۶ء۔۱۹۹۱ء) بھی اسی نقطۂ نظر کے مالک ہیں۔ انہوں نے قرآن وسنت اور

☆ گورنمنٹ ڈگری کالج جہانیاں' پاکستان anskashmiri@gmail.com

آثارِ صحابہ سے استفادہ کرتے ہوئے کافی قابلِ قدر ذخیرہ اکٹھا کر دیا ہے۔ مولانا کے نزدیک چونکہ ہر زمانہ میں خیالات کے طرزِ تعبیر، اسلوبِ تحریر اور طریقہ استدلال وغیرہ میں فرق ہوتا ہے اور سب مخاطب یکساں نہیں ہوتے ہیں اس لیے اس فرض کی ادائیگی میں ہر دور اور ہر ذہن کی رعایت ضروری ہے۔ (۲) تغیرِ احکام بتغیرِ زمان (زمانہ کی تبدیلی سے احکام کی تبدیلی) یعنی جو احکام زمانی مصلحت پر مبنی تھے، زمانہ کی تبدیلی سے چونکہ ان کی مصلحت بدل گئی ہے اس لیے ان کی تبدیلی ضروری ہوگئی ہے —— زمانہ میں تبدیلی دو وجہ سے ہوتی ہے:

(۱) فسادِ زمانہ، کہ لوگوں کی اخلاقی حالت خراب ہو جائے۔

(۲) ترقی زمانہ، کہ لوگوں کی معاشرتی حالت ترقی کر جائے۔

چونکہ یہ وجوہات ہر دور کا بنیادی جزو ہوتی ہیں اس لیے ان پر عمل بھی ناگزیر ہوتا ہے۔ ''تدوین فقہ'' کی تاریخ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عصری رجحانات و معاشرتی احوال کو فقہ کی وسعت و ترقی میں کافی دخل رہا ہے۔ جیسی جیسی ضرورتیں پیدا ہوتی گئیں، فقہ چار و ناچار وسیع ہوتا گیا۔ یہ اسلامی فقہ ہی کی خصوصیت ہے کہ اس نے جدید مسائل اور عصری رجحانات کی رعایت کو بتدریج سمیٹنے اور نئے حالات و معاملات میں درست زاویہ نگاہ دینے کی مکمل کوشش کی۔ چونکہ انسانی زندگی خود تغیر پذیر ہے تو اس میں تنظیم و تہذیب کرنے والے قوانین کیونکر تغیر پذیر نہ ہوں گے؟ اور ان کے بغیر انسانی زندگی اپنے ارتقائی عمل کو کیونکر قائم رکھ پائے گی؟ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان نے گزشتہ تین سو سالوں میں جتنی مادی ترقی کی ہے اس کی مثال تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ اس ترقی کا اثر انسانی زندگی کے بہت سے گوشوں پر پڑا ہے جس سے کئی نئی ضرورتیں پیدا ہوئی ہیں۔ ان ضرورتوں پر قابو پانے اور انہیں صحیح سمت دیے بغیر اسلام کے قانونی وقار کو برقرار رکھنا عصر حاضر کا سب سے بڑا چیلنج ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> ''..... بہت سی سماجی خرابیوں کے فروغ کی وجہ سے بعض احکام کے موقع و محل میں تبدیلی ناگزیر بن گئی اور حالات و مصالح کے بدل جانے کی وجہ سے بعض احکام پر عمل درآمد سے ان کا اصل مقصد فوت ہو رہا ہے۔ ان تمام امور میں غور و فکر کر کے فقہ کے معاشرتی و سماجی پہلو کو ضروریاتِ زندگی سے ہم آہنگ بنانے اور زندگی و قانون میں صحیح ربط پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔''(۳)

شریعتِ الٰہی کے پیش نظر ہمیشہ دو امور رہتے ہیں:

(۱) قلبی و روحانی اصلاح

(۲) معاشرتی و تمدنی فلاح

پہلی قسم کے قوانین غیر متبدل اور یکساں رہنے والے ہیں۔ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہ شکل و صورت میں ہو سکتی ہے اور نہ روح معنی میں۔ اور دوسرے قسم کے قوانین چونکہ سماجی زندگی کے مختلف حالات، وقت اور موقع کی مناسبت کے تابع ہوتے ہیں اس لیے معاشرہ کی حالت کی تبدیلی اور تمدنی ترقی کے ساتھ ان کی شکل و صورت میں تبدیلی کی گنجائش ہے۔ اس حوالے سے مولانا امینؒ کے نزدیک درج ذیل نکات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے:

☆ حالات اور تقاضوں کے مطابق قرآن و سنت کی روشنی میں نئے قوانین وضع کرنا۔

☆ پرانے اجماعی فیصلے جو حالات و مصلحت کے تابع تھے، ان میں موجودہ حالات و مصالح کے پیش نظر مناسب

ترمیم کرنا۔

☆ وہ احکام جو بتدریج نازل ہوئے ہیں' معاشرتی حالات کے لحاظ سے انہیں مقدم ومؤخر کرنا۔

☆ وہ احکام جن میں عرب کے مقامی حالات' رسم ورواج' خصائل وعادات ملحوظ ہیں' ان کی روح اور پالیسی برقرار رکھتے ہوئے جدید حالات کے پیش نظر ان کے لیے نیا قالب تیار کرنا۔

☆ وہ احکام جو وقتی تقاضا اور مصلحت کے تحت ہیں' موجودہ تقاضا اور مصلحت کے تحت ان میں مناسب ترمیم کرنا۔

☆ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب جن احکام میں مختلف الرائے ہیں' معقول دلیل کی بنا پر ان میں کسی ایک کو ترجیح دینا۔

☆ فقہاء کی مختلف آراء میں حالات وتقاضوں کی مناسبت سے ترجیحی صورت پیدا کرنا وغیرہ۔ (۴)

دور کی تبدیلی سے معاشرتی زندگی میں دو قسم کی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں:

(۱) تنظیمی تبدیلی' اور (۲) اخلاقی تبدیلی —— یہ بات درست ہے کہ تنظیمی تبدیلیوں کو قبول کیے بغیر چارہ نہیں لیکن اخلاقی تبدیلیوں سے سمجھوتہ کر لینے والی قومیں اپنا ملی وجود ختم کر بیٹھتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر ایک دور میں چوری' زنا اور اسی طرح کی دیگر اخلاقی برائیوں کا رواج ہو جائے تو انہیں اس اصول پر قبول نہ کیا جائے گا کہ یہ معاشرتی تبدیلی کے نتیجہ میں ظہور میں آئی ہیں بلکہ انہیں کسی طور قبول نہ کیا جائے گا۔ وہ مذاہب جن کی تعلیمات کا دائرہ محدود ہوتا ہے وہ بڑی آسانی سے ہر قسم کی تبدیلیوں کے ساتھ سمجھوتہ پر آمادہ ہو جاتے ہیں لیکن جس مذہب کی تعلیمات کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اس میں اور ان تبدیلیوں میں قدم قدم پر ٹکراؤ کی صورت نمودار ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کا مظاہرہ ہم اسلام اور اس کے مدمقابل مذاہب کے فکری رجحانات میں بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔

موجودہ دور میں مسلم ممالک کو اجتماعیت کی ضرورت ہے۔ طبقاتی کشمکش کا وہ عفریت جو ان دونوں اسلامی ممالک پر مسلط ہے' اس سے جان چھڑائے بغیر سرمایہ دارانہ نظام کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا امینؒ کے مطابق مذہبی طبقہ انفرادی ملکیت کی آڑ میں جاگیردارانہ نظام کو لوگوں کے استحصال کے لیے مذہبی سند فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ ان کی رائے ہے کہ موجودہ دور میں وقت کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس پر ازسرنو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''اگر مذہبی پلیٹ فارم سے انفرادی ملکیت کی آڑ میں سرمایہ داری وجاگیرداری نظام کی تائید وتبلیغ کی جاتی رہی تو لازمی طور سے وہ اشتراکیت کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوں گے جیسا کہ بعض ممالک میں ردعمل کے طور پر یہ سب کچھ ہو رہا ہے..... اگر وقت کی اس ضرورت ونزاکت کو ملحوظ نہ رکھا گیا اور سرمایہ داری وجاگیرداری سے بدستور غذا اور تقویت حاصل کی جاتی رہی تو وہ دن دور نہیں ہے کہ جو زبانیں آج انفرادی ملکیت کی آڑ میں سرمایہ داری وجاگیرداری کو ''اسلامی'' ثابت کر رہی ہیں' کل وہی زبانیں اشتراکیت کو اسلامی ثابت کرنے میں پیش پیش ہوں گی۔ جو تبدیلی اسلام کے نام پر آسکتی ہے اگر مذہبی نمائندے اس کو قبول کرنے کے لیے کسی مصلحت سے تیار نہ ہوئے تو بدترین شکل میں اس سے کہیں زیادہ تبدیلی ہو کر رہے گی۔'' (۵)

موجودہ دور میں سرمایہ دارانہ ذہنیت کے نتیجہ میں معاشرتی عدمِ توازن کا مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ امیر امیر تر ہوتا جا رہا ہے جبکہ غریب غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ ایک طرف معاشی استحصال نے غریب کو

بنیادی انسانی ضروریات سے محروم کر کے اخلاقی طور پر بدمزاج اور سماجی طور پر بدحال کر رکھا ہے تو دوسری طرف اس کے برعکس امراء نے انہی غریبوں کی ہڈیوں پر اپنے خواہشات کے محل تعمیر کر رکھے ہیں۔ اس عدمِ توازن نے انسانیت کو معاشرتی طور پر بہت پریشان کر رکھا۔ مولانا امینیؒ کا ماننا ہے کہ جب معاشرتی عدمِ توازن محرومی کی شکل اختیار کر لے تو عدل و توازن قائم کرنے کے لیے کئی قوانین میں تبدیلی ناگزیر ہوگی۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''اگر معاشرہ کا یہ حال ہو کہ ایک طبقہ وسائل حیات سے محروم ہو اور دوسرا ہر قسم کے عیش و عشرت میں مشغول ہو تو اس وقت عمل و توازن پیدا کرنے کے لیے نہ صرف سخت قوانین درکار ہوں گے بلکہ تنظیم و تقسیم کے نظام میں بنیادی تبدیلی بھی ناگزیر ہوگی، حتیٰ کہ اگر اجتماعی نظم و قوانین سے مقصود حاصل ہونے کی توقع ہوگی تو اس سے گریز جرم قرار پائے گا اور لوگوں کی حق تلفی کا باعث بنے گا۔''(۶)

چنانچہ اگر شریعتِ الٰہی میں پہلے سے اصولی شکل میں حکم موجود ہو تب بھی تبدیلی کی گنجائش موجود ہوگی۔ مولانا امینیؒ کے مطابق:

''(اگر) حکم اصولی اور کلی شکل میں موجود ہے لیکن حالات کی تبدیلی کی بنا پر اس کے موقع و محل میں تبدیلی لازمی بن گئی ہے تو روح اور پالیسی برقرار رکھتے ہوئے حال اور مقام کی مناسبت سے اس کی صورت متعین کرنا (ضروری ہوگا)، مثلاً محنت و سرمایہ میں توازن برقرار رکھنے کا مسئلہ یا حق اور فرض کے حدود متعین کرنے کا سوال ہے۔''(۷)

مولانا امینیؒ کے نزدیک معاشرتی عدم توازن میں عدل قائم کرنے کے لیے جو قوانین وضع ہوں گے وہ سب شرعی اور اسلامی ہوں گے لیکن اس کے طریقہ کار میں ان کے نزدیک اتنی گنجائش موجود ہے کہ اس طریق کار کے لیے ضروری نہیں کہ اس کا ثبوت رسول اللہ ﷺ سے ہو یا اس کے مطابق وحی نازل ہوئی ہو کیونکہ اس میں حالات و زمانہ کی رعایت سے تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ ظاہر میں یہ بات بڑی عجیب لگتی ہے کہ شرعی قوانین میں نصوص سے نکل کر کیونکر فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن درحقیقت مولانا امینیؒ کا مطمحِ نظر نصوص سے ثبوت کا نہ ملنا ان کے خلاف نہیں بلکہ اس مصلحت سے فائدہ اٹھانا ہے جو ان قوانین کی تفصیل نہ بیان کرنے میں پوشیدہ ہے۔ مولانا امینیؒ کا کہنا ہے کہ چونکہ معاشرتی زندگی کے حالات یکساں نہیں رہتے اور ان میں ہر دور میں تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے اس لیے عدل و توازن کے قوانین میں بھی یکسانیت نہیں ملحوظ رہ سکتی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''جس طرح معاشرتی زندگی کے حالات ہر دور میں یکساں نہیں ہوتے اسی طرح عدل و توازن پیدا کرنے اور برقرار رکھنے کے قوانین میں بھی یکسانیت نہیں ملحوظ رہ سکتی۔ جب قوم طبقاتی کشمکش میں مبتلا ہو، سرمایہ ایک طبقہ میں سمٹ کر رہ گیا ہو اور دوسرا طبقہ وسائل معاش سے محروم ہو کر نانِ جویں کا محتاج ہو تو ایسی حالت میں عدل و توازن پیدا کرنے کے قوانین اس وقت سے یقیناً مختلف ہوں گے جبکہ قوم خوشحال ہو اور معاشرتی عدم توازن محرومی کی حد تک نہ پہنچا ہو۔ ایسی صورت میں قرآن حکیم اگر تنظیم و تقسیم کے کسی ایک طریقہ کی نشان دہی کر دیتا یا مروجہ انفرادی و اجتماعی ملکیت کی بحث کو اصولی اور بنیادی قرار دیتا تو اس کی عالمگیریت پر کس قدر زد پڑتی؟ اور تکمیل ہدایت کی بات کس حد تک تشنہ رہ جاتی؟''(۸)

اسلامی شریعت کا یہ امتیاز ہے کہ اس میں احوال و مصالح کا بڑا اہتمام کیا گیا ہے اور شرعی احکام میں حالات

وزمانہ کی رعایت کو ہمیشہ ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مولانا امینیؒ کے مطابق معاشرہ اور شریعت میں بڑا گہرا ربط ہے اور دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ مولانا کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

''معاشرہ'' شریعت سازی کی بنیاد ہے اور احوال ومصالح عمارت تعمیر کرنے کے سامان ہیں۔ جب معاشرہ میں تبدیلی ہوگی تو لازمی طور سے احکامِ شرعیہ کی شکل وصورت بدلے گی اور جب احوال ومصالح باقی نہ رہیں گے تو ان سے بنی ہوئی عمارت بھی ختم ہوجائے گی۔ ہدایت الٰہی نے ہمیشہ ''شرائع'' کے نزول میں بنیاد وسامان دونوں کا لحاظ کیا ہے اور اسی وجہ سے شرائع ومناہج کے اختلاف کو برقرار رکھا ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر کسی زمانہ میں ان کا لحاظ نہ کیا تو شریعت اور معاشرہ کا رشتہ منقطع ہوجائے گا' پھر شریعت زندگی سے کنارہ کشی پر مجبور ہوگی یا اس کی چاکری میں مشغول رہے گی۔''(۹)

چنانچہ نبی کریم ﷺ کے متعدد فیصلے اس پر دلالت کرتے ہیں۔ نیز شراب کی حرمت کا حکم اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم بھی اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ شریعت سازی میں احوال ومصالح کی رعایت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ اگر شروع دن سے شراب کی حرمت کا حکم نازل کردیا جاتا تو اس بات کا اندیشہ تھا کہ اس پر عمل نہ کیا جاتا۔ کیونکہ عرب کا معاشرہ اس وقت اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ نیز اس سے معاشرتی اصلاح کی بجائے فکری انتشار کا قوی اندیشہ تھا۔ اسی طرح کی دیگر بہت سی مثالیں ہیں جن سے حالات وزمانہ کی رعایت کا پتا چلتا ہے۔ مولانا امینیؒ کا ماننا ہے کہ موجودہ دور میں بھی نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس نوعیت کے احکام اور فیصلوں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے جن میں شرعی احکام کے حوالے سے حالات وزمانہ کی رعایت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

قرآن کریم کے حوالے سے ایک بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ یہ ہمیشہ اصول اور بنیادی مباحث ہی کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ یہ بنیادی مباحث وہ ہیں جن کی ہر دور اور ہر زمانہ میں یکساں ضرورت رہتی ہے۔ البتہ ذرائع اور طریقہ کار میں چونکہ ردوبدل ہوتا رہتا ہے اور ایک چیز جو ایک وقت میں کسی اور شکل میں تھی اور پھر حالات کے پیش نظر اسے کسی اور رنگ میں پیش کرنا پڑا تو اس سے قرآن کریم کے ثبات ودوام اور رعایت زمانہ کا ثبوت ملتا ہے۔ اگر زمانہ نزول میں کسی ایک طریقہ اور ذریعہ کی نشاندہی کردی جاتی تو بعد میں حالات کی تبدیلی سے اس میں تبدیلی ناگزیر ہوتی اور پھر قرآن حکیم کے ثبات ودوام کی کوئی صورت نہ باقی رہتی۔ چنانچہ قرآنِ کریم کی بہت سے آیات ایسی ہیں جن سے حالات وزمانہ کی رعایت پر استدلال کیا جاتا ہے۔ ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

☆ ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

''اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے اور دشواری نہیں چاہتا۔''

☆ ﴿وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (الحج:۷۸)

''اور اس (اللہ) نے تم پر دین میں کچھ مشکل نہیں رکھی۔''

☆ ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرۃ:۲۸۶)

''اللہ کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔''

☆ ﴿مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّ لٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ﴾ (المائدۃ:۶)

''اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر تنگی کرے لیکن وہ چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے۔''

قرآنِ کریم سے حالات وزمانہ کی رعایت کے ثبوت مولانا نے بھی پیش کیے ہیں' جن کو اختصار کے ساتھ ذیل میں بیان کیا جاتا ہے:

(۱) قرآن کریم دفعتاً نازل نہیں ہوا بلکہ اس کے نزول میں تدریج کا اصول کارفرما رہا۔ مولانا امینیؒ اس تدریج سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس طریق نزول سے ایک طرف حالات وزمانہ کی رعایت کا ثبوت ملتا ہے تو دوسری طرف قانون میں باہمی ربط کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

(۲) قرآنِ حکیم میں بیان کردہ اصولِ نسخ کے ذریعہ احکام کے موقع ومحل متعین کرنے کی اجازت دی گئی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ معاشرہ شریعت سازی کی بنیاد ہے اور احوال ومصالح عمارت تعمیر کرنے کے سامان ہیں۔ چنانچہ نسخ کے اصول سے بھی حالات وزمانہ کی رعایت کا ثبوت ملتا ہے۔

(۳) قرآن حکیم نے احکام کے بیان کا جو انداز اختیار کیا ہے اس سے بھی حالات وزمانہ کی رعایت کا ثبوت ملتا ہے۔ مثال کے طور پر بعض احکام میں محض مقاصد بیان کیے گئے جبکہ ان کی شکل وصورت کا تعین نہیں۔ اسی طرح بعض احکام میں جزئیات کی تشریح سے بحث کر کے بات کو طول نہیں دیا گیا۔ لیکن کئی جزئیات کی تشریح کے باوجود اس کے موقع ومحل کی تعیین کی اجازت دی گئی ہے۔

(۴) قرآنِ حکیم نے عدل کو معیارِ حق بنایا ہے لیکن مولانا امینیؒ کے مطابق جس طرح معاشرتی زندگی کے حالات یکساں نہیں رہتے اسی طرح عدل وتوازن برقرار رکھنے کے لیے اس میں بھی تبدیلی کی گنجائش قرآن حکیم سے ثابت ہے۔[۱۰]

مولانا امینیؒ کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی معاشرتی اور سماجی زندگی کے بہت سے واقعات کو ہم یہ کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ آپ ﷺ کی خصوصیات پر محمول ہیں (یعنی قاعدہ وقانون کے تحت نہیں آتے ہیں) حالانکہ غور سے دیکھا جائے تو ان سے اختیار کی وسعت کا ثبوت ملتا ہے۔ نیز وسعت وتنگی کے مذکورہ اصول کی تائید نکلتی ہے۔ مثلاً:

(۱) ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں نے جرم کا ارتکاب کیا ہے (یعنی میں نے شراب پی ہے)' لہٰذا میرے اوپر حد (سزا) جاری کر دیجیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم نے ابھی ہمارے ساتھ نماز پڑھی ہے؟'' اس نے عرض کیا: جی ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جاؤ اللہ نے تمہارا قصور معاف کر دیا''۔[۱۱] اس معافی کا اثر اس شخص پر یہ ہوا کہ اس نے شراب نوشی سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اس نے کہا کہ آپ ﷺ کے کوڑوں (شراب کی سزا) کے خوف سے شراب ترک کرنے کو میں اپنی توہین سمجھتا تھا جب آپ ﷺ نے مجھے معاف کر دیا تو واللہ اس ملعون (شراب) کو کبھی ہاتھ نہ لگاؤں گا۔

(۲) ایک واقعہ میں مجرم کی جگہ غیر مجرم (جو بچانے کے لیے آیا تھا) کو پکڑ لیا گیا اور دربارِ نبوت سے اس کو سزا کا حکم بھی سنا دیا گیا۔ یہ صورت دیکھ کر مجرم نے خود آگے بڑھ کر جرم کا اعتراف کیا اور ماخوذ شخص کو اس سے بریٔ الذمہ قرار دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے دونوں کی سزا معاف فرما دی۔[۱۲] اگرچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

جیسے فقیہہ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مجرم کو سزا نہ دینا جرم کی حوصلہ افزائی ہوگی لیکن نبی کریم ﷺ کی دور بین نگاہ اس حقیقت پر تھی کہ دوسرے شخص کو موت سے بچالینا از خود اتنی بڑی نیکی اور توبہ کی ایک شکل ہے کہ اس کے بعد کسی اور بات کی گنجائش نہیں رہتی۔

(۳) اس طرح فتح مکہ کے موقع پر اہلِ مکہ کے سردار اور اسلام کے دشمن ابوسفیان کے گھر کو رسول اللہ ﷺ نے دارالامان کا درجہ دیا جبکہ کفار سے کسی قسم کی رعایت نہ کرنے کا حکم تھا۔ (۱۳) اس سے بھی حالات وزمانہ کی رعایت کا ثبوت ملتا ہے۔

(۴) مولانا امینیؒ صلح حدیبیہ کو بھی بطور دلیل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''صلح حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے جو روش اختیار فرمائی اور بعض صحابہؓ کی مخالفت کے باوجود جس طرح معاہدہ کی تکمیل کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرعی سیاست کے فیصلے کس قدر جذبات سے بالا ہوکر حقیقت شناسی اور دوررسی کے حامل ہوتے ہیں..... سوچنے کی بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر اجتماعی مفاد کے تحفظ اور مستقبل کی تعمیر کی خاطر جذباتی چیزوں اور انفرادی مفاد کو کس طرح نظر انداز کیا تھا؟ اور بڑی چیز کی خاطر چھوٹی چیزوں کو نظر انداز کرنے کا کیسا نمونہ پیش کیا تھا؟'' (۱۴)

(۵) معاہدہ سے پہلے جب اہلِ مکہ قحط سے دوچار ہوئے تو باوجود دشمنی کے ان کی مدد فرمائی۔ (۱۵) گویا انسانیت دشمنی پر مقدم ہے۔

(۶) حطیم خانہ کعبہ کا ایک حصہ تھا اور کعبہ سے علیحدہ تھا رسول اللہ ﷺ نے (باوجود چاہنے کے) خانہ کعبہ کے ساتھ شامل نہیں فرمایا اور وجہ یہ بیان فرمائی:

''اگر تیری قوم نئی نئی کفر سے اسلام کی طرف نہ آئی ہوتی تو میں کعبہ کو توڑ کر اساسِ ابراہیم پر اس کی تعمیر کراتا اور حطیم کو اس میں شامل کردیتا۔'' (۱۶)

(۷) قربانی کا گوشت تین دن سے زائد ذخیرہ بنا کر رکھنے سے روک دیا تھا تاکہ گاؤں کے لوگ محروم نہ رہیں۔ پھر جب آپ ﷺ سے شکایت کی گئی اور مختلف قسم کی ضرورتیں بیان ہوئیں تو آپ ﷺ نے اجازت دے دی۔ (۱۷) اگرچہ نبی کریم ﷺ کا پہلا حکم دوسرے حکم سے منسوخ ہوگیا لیکن اگر موجودہ دور میں بھی وہ حالات پیدا ہوجائیں جن کی بنا پر ممانعت کی گئی تھی تو حاکم وقت پہلے حکم کو نافذ کرنے کا مجاز ہوگا کیونکہ اس فیصلہ کا تعلق حالات وزمانہ اور موقع ومحل سے ہے۔

(۸) اجنبی عورتوں کو دیکھنے سے منع کیا گیا ہے تاکہ وساوسِ شیطان وفساد کا دفعیہ ہو اور اللہ کی حرمتیں محفوظ رہیں لیکن جس سے شادی کا ارادہ ہو رسول اللہ ﷺ نے اس کو دیکھنے کی اجازت دی تاکہ بعد میں ندامت نہ ہو اور ازدواجی زندگی خوشگوار رہ سکے۔ (۱۸)

(۹) حدود کو قائم کرنے کا حکم ہے لیکن خود رسول اللہ ﷺ نے جنگ اور دشمن کی سرزمین میں حدود قائم کرنے سے منع کیا ہے۔ (۱۹) چنانچہ حدیث میں آتا ہے: ((لا تقطع الایدی فی الغزو)) (۲۰) ''جنگ میں ہاتھ مت کاٹو۔'' ایک دوسری روایت میں ہے: ((لا تقطع الایدی فی السفر)) (۲۱) ''سفر میں ہاتھ مت کاٹو۔''

(۱۰) رسول اللہ ﷺ نے اشخاص وحالات کے لحاظ سے سوالات کے مختلف جوابات دیے ہیں مثلاً کسی کے لیے نماز سب سے افضل قرار دی اور کسی کے لیے جہاد کو افضل بتایا اور کسی سے والدین کی خدمت کو افضل فرمایا' وغیرہ۔ (۲۲)

(۱۱) نہی عن المنکر کی اہمیت کے باوجود جب اس عمل سے کسی زیادہ بڑی برائی میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو تو روک ٹوک کرنے کی ممانعت ہے۔ (۲۳) گویا مقصود فتنہ اور انتشار کا ازالہ ہے' اگر برائی سے روکنے پر اس کے بڑھنے کا اندیشہ ہو تو اس انتہائی اہم اور مفید عمل سے بھی رکنا اور صبر کرنا سنت ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بہت سے احکام کے موقع ومحل متعین کیے تھے اور انتظامی احکام کا اضافہ کیا تھا۔ ان احکامات میں صحابہ کرامؓ نے قرآن وسنت سے حتی الوسع استفادہ کرنے کی کوشش کی لیکن جن مواقع میں ضرورت پڑی اجتہاد سے کام لینے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ مولانا امینیؒ لکھتے ہیں کہ:

> ''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جن صورتوں میں حالات وزمانہ کی رعایت سے قیاس اور رائے کے استعمال کو ضروری جانا' قرآن وسنت کی روشنی میں اس کے لیے ضابطہ مقرر فرمایا۔'' (۲۴)

لیکن اس حوالے سے صحابہ کرامؓ نے انتہائی احتیاط کا مظاہرہ کیا۔ حالات وزمانہ کی رعایت سے جس قدر اجتہاد کی ضرورت ہوتی یا رائے استعمال کرنے کی نوبت آتی تو مقاصد شریعت اور اصولِ دین سے سرِ مو تجاوز نہ فرماتے۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ سلطنت کی وسعت' جدید مسائل اور ان کے تنوع کی وجہ سے صحابہ کرامؓ کے دور میں حالات وزمانہ کی رعایت کے دائرہ میں کافی وسعت پیدا ہوئی۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ نے نصوصِ شرعیہ سے کام لیتے ہوئے بدلتے ہوئے حالات میں اسلام کی ایسی ترجمانی کی جو بعد میں آنے والے تمام زمانوں میں مثالی حیثیت رکھتی ہے۔

حالات وزمانہ کی رعایت کے حوالے سے صحابہ کرامؓ کے پیش نظر ہمیشہ درج ذیل امور رہے:

- ☆ اجتماعی مفاد کو ہمیشہ ترجیح دی۔
- ☆ فتنہ وفساد کو ہمیشہ رفع کرنے کی کوشش کی۔
- ☆ عدل وتوازن قائم کرنے کی کوشش کی۔
- ☆ موقع ومحل کا ہمیشہ لحاظ رکھا۔
- ☆ معاشی مساوات قائم کرنے کی کوشش کی۔

یہ تمام وہ امور ہیں جن میں صحابہ کرامؓ نے کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کیا اور اس حوالہ سے شرعی احکام میں جب بھی اور جتنا بھی موقع ملا حالات وزمانہ کی رعایت کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ مولانا امینیؒ نے صحابہ کرامؓ کے عمل سے حالات وزمانہ کی رعایت کی جو مثالیں بیان فرمائی ہیں ان کا اختصار یہ ہے:

(۱) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عورت کو طلاق کے بعد دوسرے نکاح کے باوجود بچے کی پرورش کا حق دار ٹھہرایا۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے طلاق وجدائی کے بعد عورت کو بچہ کی پرورش کا حق دار اس وقت تک ٹھہرایا ہے جب تک دوسری شادی نہ کرے۔ (۲۵) مولانا امینی کے مطابق حضرت ابوبکرؓ نے ایسا نبی کریم ﷺ کے عمل کے خلاف نہیں کیا بلکہ موقع ومحل کی نسبت سے اور حالات وواقعات کو مدنظر رکھتے

ہوئے کیا۔[۲۶] گویا فیصلہ تو نبی کریم ﷺ کا ہی ہوگا لیکن آپ ﷺ نے بھی اپنے فیصلہ میں چونکہ عورت ہی کو سہولت دی ہے اس لیے حاکمِ وقت کو اس کی اجازت ہوگی کہ وہ حالات کے مطابق فیصلہ کرے۔

(۲) حضرت ابوبکرؓ نے ان عورتوں کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے وصال پر دف بجایا تھا۔[۲۷] حالانکہ قرآن وسنت میں ایسے جرم پر قطع ید کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ مولانا امینیؒ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اس قسم کی مثالوں میں بظاہر قرآن وسنت کی مخالفت معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقتاً مخالفت نہیں ہے۔ ان بزرگوں نے جتنے اجتہادات کیے ہیں اور مجموعہ کو سامنے رکھ کر ہی احادیث واحکام کے موقع ومحل متعین کیے ہیں اس بنا پر ہمارے لیے صحابہ کا طرزِ عمل حجت ہے اور اسی پر ملی مسائل کا حل موقوف ہے۔''[۲۸]

(۳) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے متوقع فتنہ کے پیش نظر کتابیہ عورت سے نکاح کرنے کی ممانعت کردی[۲۹] حالانکہ قرآن وسنت میں اس کی صریح اجازت موجود ہے۔ حضرت عمرؓ کا یہ عمل قرآن وسنت کے خلاف نہیں تھا بلکہ متوقع فتنہ کے ازالہ کی نیت سے ایسا کیا۔ مولانا امینیؒ نے حضرت عمرؓ کے اس فیصلہ کی توجیہہ یہ بیان فرمائی ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے اسی فیصلہ کی خود وضاحت فرمائی ہے:

''میں ڈرتا ہوں کہ دوسرے مسلمان تمہاری اقتداء کریں گے اور ذمیہ عورتوں کے جمال کی وجہ سے مسلم عورتوں پر ان کو ترجیح دیں گے' یہ بات بڑی آسانی سے فتنہ بن سکتی ہے۔''[۳۰]

(۴) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو قانوناً زمین اور جائیداد رکھنے سے منع کردیا جبکہ اس سے پہلے اس کی ممانعت نہیں تھی۔[۳۱] حضرت عمرؓ نے یہ عمل اس لیے کیا کہ ان کی خلافت میں ہر ایک کو وظیفہ ان کی خلافت کے ذمہ تھا۔ اگر جائیداد کی اجازت بھی دے دی جاتی تو سرمایہ داری کی حوصلہ افزائی ہوتی جو ظاہر ہے کہ اسلام کی روح کے خلاف ہے۔ اس کی طرف علامہ طنطناوی جوہریؒ نے بھی اشارہ کیا ہے۔[۳۲] اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا امینی لکھتے ہیں کہ:

''دراصل اسلام ایک ایسی صالح جماعت تیار کرکے برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ جس کا مقصد جان ومال کی قربانی کرکے دوسروں کے لیے رحمت کا ماحول پیدا کرنا ہو۔ یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک دلوں سے ذاتی منفعت اور عیش وعشرت کے ''بُت'' نہ نکالے جائیں۔''[۳۳]

گویا اگر معاشرہ میں حکومت وقت اپنی بنیادی ذمہ داریوں کو پورا کرتی ہے اور لوگوں کو معاشی طور پر مستحکم اور سماجی طور پر امن کی دولت سے نوازتی ہے تو حکومت وقت کو اجازت ہے کہ وہ سرمایہ داری اور جاگیرداری کا راستہ روکنے کی غرض سے اس پر پابندی لگادے۔

(۵) اسلام میں چور کی سزا قطع ید مقرر ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر مال کی دوگنی قیمت وصول کی نیز بھوک وقحط کے عام ابتلاء میں قطع ید سے روک دیا۔ اگرچہ حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ اس قرآنی آیت کے خلاف معلوم ہوتا ہے ﴿وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَهُمَا﴾ (المائدۃ:۳۸) ''چوری کرنے والے مرد اور عورت کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں''۔ کیونکہ اس آیت میں عموم پایا جاتا ہے لیکن اگر قحط کے دوران بھی

اسی فیصلہ کو باقی رکھا جاتا تو مزید فتنہ کا اندیشہ تھا جو ظاہر ہے اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ چنانچہ اس فتنہ کے پیش نظر حضرت عمرؓ نے یہ فیصلہ جاری کیا۔

(۶) عراق وشام کی مفتوحہ زمین کو حضرت عمرؓ نے مجاہدین میں تقسیم کرنے کی بجائے وسیع تر اجتماعی مفاد کے پیش نظر اسے خلافت کی ملکیت قرار دیا۔[۳۴] حالانکہ اس سے پہلے ایسی کوئی مثال قرآن وسنت سے ثابت نہ تھی۔ حضرت عمرؓ کے اس فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا امینؒ لکھتے ہیں کہ:

''فوجیوں میں زمین کی تقسیم وعدم تقسیم کا معاملہ اس دور کی معاشرتی وسماجی مصالح کی بنا پر تھا۔ اس لیے موجودہ دور میں نہ تقسیم کو بنیاد بنا کر ملکیت زمین کی آڑ میں زمینداری وجاگیرداری کا جواز تلاش کیا جاسکتا ہے اور نہ عدمِ تقسیم سے اسلام کے زرعی نظام کو اشتراکیت کے زرعی نظام میں محدود کرنے کی گنجائش نکلتی ہے۔ بلکہ ان دونوں صورتوں سے ان کی اصل روح اور مقصد میں استفادہ کیا جاسکتا ہے تاکہ حالات کے تقاضا کے مناسب زمین کی تنظیم وتقسیم کا نظام قائم ہوسکے۔''[۳۵]

(۷) حضرت عمرؓ نے ضحاک بن خلیفہ کو آب پاشی کے لیے محمد بن مسلمہ کی زمین سے ان کی مرضی کے بغیر پانی لے جانے کا حکم دیا۔[۳۶] حالانکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ کسی مسلمان مرد کا مال اس کی رضامندی کے بغیر حلال نہیں ہے۔ موجودہ دور میں جبکہ اکثر لڑائی جھگڑے اور فساد اسی بنا پر ہوتے ہیں تو اگر حضرت عمرؓ کے فیصلہ پر عمل کرنے کے لیے حکومتِ وقت اپنی ذمہ داری صحیح طور پر ادا کرے تو اس سے مسئلہ پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

(۸) حضرت عمرؓ نے غیر مسلموں کو بھی حکومت میں شریک ودخیل بنایا[۳۷] حالانکہ اس سے پہلے ایسی کوئی مثال موجود نہ تھی۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے کہ:

''اصل چیز حکومت کا مزاج اور اس کی پالیسی ہے۔ بسا اوقات غیر مسلم سے نظم وانتظام کی توقع مسلمان سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس بنا پر حضرت عمرؓ نے پارٹی پالیٹکس کو اس میں داخل ہونے دیا اور نہ مسلم وغیر مسلم میں کوئی تفریق کی۔ حالانکہ اس سے پہلے نظم وانتظام محدود ہونے کی وجہ سے غیر مسلموں کی زیادہ شرکت نہ تھی۔''[۳۸]

گویا اسلامی حکومت وسیع تر اجتماعی مفاد کے پیش نظر نیز اس بنا پر کہ موزوں جگہ پر بلاتفریق مذہب موزوں شخص کی تعیناتی ہو اس بات کی مجاز ہے کہ وہ کسی غیر مسلم کو بھی حکومت میں جگہ دے سکتی ہے۔ دورِ قریب میں اس کی عمدہ مثال ہندوستان میں شہنشاہ اکبر کی حکومت ہے جس میں بلاتفریق مذہب حکومتی مناصب پر غیر مسلم لوگوں کو بھی مساوی جگہ دی گئی۔ اگرچہ اکبر کے نظریات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے دور کے مجموعی معاشرتی حالات آج بھی دنیا کے لیے ایک روشن مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۹) حضرت عمرؓ نے انفرادی ملکیت پر اجتماعی مفاد کو ترجیح دی۔[۳۹] اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا امینؒ نے لکھا ہے کہ:

''شخصی آزادی اور انفرادی ملکیت دو بڑے ''بت'' ہیں جن کی مدد سے ایک طبقہ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر عیش کرتا ہے اور دوسرا طبقہ محنت ومشقت کے باوجود نان جویں کا محتاج رہتا ہے۔ بدقسمتی سے ذرائع پیداوار کی تنظیم میں ان دو ''بتوں'' کو مذہب کا سرٹیفکیٹ حاصل ہوگیا ہے۔ جب کبھی حالت وضرورت کی

بنا پر اجتماعی کاشت و تنظیم کا ذکر آتا ہے تو فوراً یہ کہہ کر مخالفت شروع کر دی جاتی ہے کہ اس میں لامذہبیت سرایت کی ہوئی ہے جو باہر سے برآمد کی گئی ہے۔ گویا اسلام نے اس سلسلہ میں کوئی رہنمائی نہیں کی اور تنظیم و تقسیم میں حالت وضرورت کا کوئی لحاظ نہیں کیا ہے۔''(۴۰)

(۱۰) حضرت عمرؓ نے غلامی کے رواج کو ختم کرنے کی کوشش کی۔(۴۱) اگرچہ نبی کریم ﷺ نے بھی اسے ناپسند کیا ہے اور اسے بتدریج ختم کرنے کی کوشش کی لیکن حضرت عمرؓ نے حالات وزمانہ کی رعایت کے پیش نظر اس عمل کو مزید آگے بڑھایا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''اگر مذہب قدیم تنظیم کا نام ہوتا تو حضرت عمرؓ غلامی کے رواج کو ختم کرنے کی راہیں نہ نکالتے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کرتے کہ ہر طرح کے حقوق دے کر معاشرہ میں ان کا مقام اونچا کر دیتے..... لیکن ایک دم سے ختم کرنے میں سماجی زندگی کے مختل ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس بنا پر رسول اللہ ﷺ نے بتدریج ختم کرنے کی کوشش کی۔ پھر حضرت عمرؓ نے اس کوشش کو اور آگے بڑھایا جس کے لیے مختلف طریقے وضع کیے۔''(۴۲)

صحابہ کرامؓ کے بعد فقہاءِ اسلام کو ان کی بہ نسبت قدرے زیادہ مشکل حالات اور مختلف مسائل سے واسطہ پڑا۔ لیکن چونکہ قرآن وسنت کے ساتھ ساتھ صحابہ کرامؓ کا عمل بھی ان کے سامنے تھا لہٰذا ان کی روشنی میں انہیں اصول وکلیات کی تدوین کا بہت عمدہ موقع میسّر آیا۔ چنانچہ فقہاء اسلام نے ایسے اصول وضع کر دیے جن سے ہر دور اور ہر زمانہ میں استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ فقہاء کے اخذ کردہ چند اصول وقواعد پیش خدمت ہیں:

(۱) **المشقة تجلب التيسير**(۴۳) ''دشواری آسانی لاتی ہے''

شرعی احکام کی بجا آوری میں انسان کو طبعی یا تمدنی عوارض پیش آجاتے ہیں' شریعت میں ان کی رعایتیں موجود ہیں۔ یہ اصول ان ہی حالات کے لیے ہے —— شریعت میں جو آسانیاں اور تخفیفات دی گئی ہیں ان کے سلسلہ میں چند باتیں اور ملحوظ رکھنی چاہئیں:

(ا) سب سے پہلی بات یہ ہے کہ فقہاء نے جو رعایتیں اور سہولتیں دی ہیں وہ خود ان کی وضع کردہ نہیں ہیں بلکہ وہ سب کتاب وسنت کے اصولی احکام کے تحت دی گئی ہیں۔

(ب) دوسری بات یہ کہ جو آسانیاں اور تخفیفات دی گئی ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی مشقت و دقت کی وجہ سے کسی حرام چیز کے استعمال کی اور کسی حلال چیز کے ترک کی مستقل صورت پیدا کی گئی ہے۔

اگر فقہاء ہر مشقت میں رخصت وسہولت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک ہی حکم ہر ایک کے لیے وضع کر دیتے تو دین بازیچہ اطفال بن کر رہ جاتا۔ اسی کی طرف مولانا امینیؒ نے بھی اشارہ کیا ہے:

''یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ فقہاء نے ہر مشقت کو زیر بحث مشقت میں شمار کیا اور نہ تخفیف وسہولت کو اس قدر عام کیا ہے کہ انسان جب چاہے اس کی راہیں نکال لے بلکہ ہر ایک کے لیے فقہ میں اصول و ضوابط مقرر اور حدود و قیود متعین ہیں۔ الٰہی حکمت کا بھی تقاضا یہی ہے کہ اس معاملہ میں انسان آزاد نہ چھوڑا جائے۔ ورنہ دین سہل پسند اور ناعاقبت اندیش لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ جائے گا۔''(۴۴)

اسی طرح ان کے نزدیک انسان کی معاشرتی اور سماجی زندگی کے باریک تاروں کو سمجھنا اور پھر اس کی روشنی

میں راہِ عمل متعیّن کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اگر ایسا ہی آسان ہوتا تو جس طرح عالمی تصرّفات کو انسان کے حیطہ اقتدار میں دے دیا گیا ہے اسی طرح انسانی حالات کو بھی دے دیا جاتا۔ اس کے لیے نہ ہدایتِ الٰہی کے تسلسل کی ضرورت ہوتی اور نہ دین کی تکمیل کی۔ غرض مشقت کے استعمال اور اس کے ذریعہ رخصت وسہولت کی اجازت میں بڑی احتیاط اور نکتہ سنجی کی ضرورت ہے۔ نہ ہر شخص یہ کام کر سکے گا اور نہ اس کے بارے میں ہر ایک کا فیصلہ قابل اعتبار ہوگا۔ بلکہ یہ کام وہی مجوزہ مجلس کرے گی جس کا ذکر مولانا امینیؒ نے اپنی تحریروں میں خاص طور پر کیا ہے۔ صرف اسی صورت اس کی افادیت اور قبولیت میں اضافہ ہوسکتا ہے۔

نیز اس کی افادیت کے پیش نظر مولانا امینیؒ کی ایک رائے یہ بھی ہے کہ احکام وقوانین کے نفاذ کے حوالہ سے اصولِ تدریج سے کام لیا جائے۔ کیونکہ یہ اصول ہے کہ کوئی بھی حکم جو تدریج کے اصول سے خالی ہو اس میں وہ جامعیت اور پختگی نہیں پائی جاتی جو مطلوب ہوتی ہے۔ چنانچہ اصول تدریج کے حوالے سے قرآن کی مثال سب سے نمایاں ہے کہ کس طرح قومی مزاج وطبیعت کا لحاظ اور معاشرتی حالات وواقعات کو اس میں جگہ دی گئی ہے۔

(۲) الضرورات تبیح المحظورات[۴۵] ''ضرورت ممنوع چیزوں کو مباح کر دیتی ہے''

مولانا امینیؒ کے نزدیک اس اصول سے فقہاء نے درج ذیل قسم کے مسائل نکالے ہیں' مثلاً:

☆ انتہائی بھوک کی حالت میں جان بچانے کی غرض سے مردار اور دیگر حرام اشیاء کا کھانا جائز ہے۔

☆ حلق میں لقمہ پھنس جائے تو شراب جیسی چیز سے گلوخلاصی کی اجازت ہے۔

☆ جبر وزبردستی کی حالت میں زبان سے کلمہ کفر نکال دینا جائز ہے بشرطیکہ دل ایمان پر مطمئن ہو۔

☆ اگر کوئی ایسا شخص کسی کا قرض نہ ادا کرتا ہو جس کے پاس مال موجود ہو تو قرض خواہ کے لیے مقروض کی اجازت کے بغیر قرض کی مقدار کے برابر لینا جائز ہے۔

☆ حملہ آور کو ہر طریقہ سے ہٹانا جائز ہے خواہ اس میں حملہ آور کے قتل تک نوبت آجائے۔[۴۶] اس اصول کے ساتھ فقہاء نے یہ شرط بھی لگائی ہے کہ:

> ''جو چیز کسی ضرورت کے تحت مباح کی جائے گی وہ بس ضرورت بھر ہی مباح ہوگی۔ جو چیز کسی عذر کی وجہ سے جائز کی جائے گی اس کا جواز عذر کے زائل ہونے کے بعد ختم ہوجائے گا۔''[۴۷]

کچھ لوگ اپنی خواہش کی آڑ میں اس اصول کا غلط استعمال بھی کرتے ہیں' چنانچہ علامہ شاطبیؒ نے اس کی وضاحت بھی فرمادی کہ:

> ''لوگ اس اصول کی آڑ میں اپنی کسی خواہش کی تکمیل چاہتے ہیں۔ حالانکہ انسان کی جو واقعی ضرورتیں ہیں ان کا ذکر تو شریعت نے خود ہی کر دیا ہے۔''[۴۸]

دورِ حاضر میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن میں مسلمان نہ چاہتے ہوئے بھی کسی نہ کسی طور پر سود یا اسی طرز کے کسی دیگر حرام کام میں ملوث ہیں۔ چونکہ انسانی اعمال کا دارومدار نیت پر ہے تو جو لوگ ایسے کاموں کو سرے سے حرام سمجھتے ہی نہیں' ان پر اس کا جرم ہوگا۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو یہ کام اس نیت سے کرتے ہیں کہ ان کے پاس اس کا متبادل نہیں' ان کے لیے اباحۃً اجازت ہوگی۔

(۳) العادة محكمة [۴۹] ''عادت حکم (فیصلہ کرنے والی) بنائی گئی ہے''

اس اصول کا تعلق مادی و معنوی ماحول' آب و ہوا اور موسم وغیرہ سے ہے۔ چونکہ ان امور میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے اس لیے ان میں ایک ہی حکم یا طریق کار کی پابندی سے تنگی و دشواری پیش آئے گی۔ چنانچہ ایک حکم جو ایک ملک والوں کے لیے ہے اور فرض نہیں ہے تو ضروری نہیں کہ وہ ایک دوسرے ملک میں بھی اسی طرح مسلّط کر دیا جائے۔ مولانا امینیؒ نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ:

''جب کسی زمانہ میں مشرق و مغرب کا یہ تفاوت ختم ہو جائے یا مشرق میں عادت بدل جائے اور مغرب میں عادت اس کے برعکس ہو جائے تو اسی مناسبت سے حکم میں بھی تبدیلی ہوتی رہے گی۔ اس اختلاف پر وہ تمام مسائل مبنی ہوں گے جن کا تعلق انسانوں کی وضع داری اور حیثیت و عزت سے ہے۔ چنانچہ یورپ والوں کے لیے ننگے سر نماز پڑھنے اور ننگے سر پھرنے میں کوئی قباحت نہیں اور ایشیا والوں کے لیے (جب تک عادت نہ بدلے) قباحت ہے۔ البتہ اس قسم کی چیزیں اگر ایشیا میں بھی عادت کا درجہ اختیار کر لیں تو پھر ان میں یہاں بھی کوئی قباحت نہ باقی رہے گی۔''(۵۰)

(۴) تصرف الامام علی الرعیة منوط بالمصلحة [۵۱] ''عوام کے معاملات میں قوتِ نافذہ کے تصرفات مصلحت پر مبنی ہونے چاہئیں''۔

قوتِ نافذہ سے مراد حکومتی اختیارات یا طاقت کے ہیں۔ گویا اگر حکومت عوامی معاملات میں اپنی طاقت کا استعمال کرنا چاہے تو وہ مصلحت پر مبنی ہونی چاہیے۔ چنانچہ اجتماعی مفاد کے پیش نظر اگر کسی کا انفرادی نقصان ہو رہا ہے تو اجتماعی مفاد کو اہمیت دی جائے گی۔ اگرچہ قوتِ نافذہ کے زیر اثر بہت طاقت ہے' لیکن مولانا امینیؒ نے اس کی بھی حدود و قیود بیان فرمائی ہے۔ تاکہ حکومت میں ڈکٹیٹر اور مطلق العنانیت کی خامیاں نہ پیدا ہو جائیں اور ذاتی مفادات کو اجتماعی مفاد کا نام دے کر لوگوں کا ناجائز استحصال نہ کیا جا سکے۔ چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

''قوتِ نافذہ مصلحت اور مفادِ عامہ کا فیصلہ کرنے میں آزاد نہیں بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس فیصلہ میں شریعت کے نقطہ نظر کا پورا لحاظ رکھے اور اس کے فیصلہ سے شریعتِ مطہّرہ کی خلاف ورزی نہ لازم آئے۔ ورنہ وہ فیصلہ قابل نفاذ نہ ہو سکے گا..... قوتِ نافذہ کو اس قسم کے تصرفات کا بھی اختیار نہیں جس میں ظاہر نظر میں عمومی فائدہ ہو' مگر یہ فائدہ مضرتوں کا سبب بن سکتا ہو۔ چنانچہ کسی کو ایسی جگہ مسجد تعمیر کرنے کی اجازت یا توسیع کا حکم دینا جس جگہ سے لوگوں کا عام مفاد وابستہ ہو اور کاروبار میں آنے جانے والوں کو تکلیف ہوتی ہو' ناجائز ہے۔''(۵۲)

(۵) کل ما تجاوز عن حده انعکس الی ضده [۵۳] ''جو شے اپنی حد سے تجاوز کر جائے وہ اپنی ضد کی طرف لوٹ آتی ہے کہ اس کے بغیر توازن نہیں پیدا ہو سکتا''۔

بسا اوقات ابتدائی مرحلے میں ایک شے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس کو دوامی حیثیت نہیں دی جا سکتی یا انتہا میں اس کی ضرورت ہوتی ہے اور اس سے پہلے کے مرحلات اس کے متحمل نہیں ہوتے ہیں۔ اصلاحی اور تعمیری پروگرام میں اس قسم کی بے شمار صورتیں پیدا ہوتی اور ختم ہوتی رہتی ہیں۔ اس لیے نہ انہیں دائمی قانون کا درجہ

حاصل ہوتا اور نہ وہ دائمی طور پر عمل کے لیے ہوتی ہیں۔لیکن ایک مدت تک ان کو کرتے رہنے سے انہیں ایسی مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ اصل دین اور قانون کی جگہ لے لیتی ہیں۔ایسے موقعوں پر مذکورہ بالا اصول کی زیادہ ضرورت پیش آتی ہے۔ چنانچہ انقلابی تحریکات میں بہت سے ایسے موڑ آتے ہیں جہاں ان کے اکثر عمل زیادتی نظر آتے ہیں لیکن دراصل ان تحریکات کی یہی زیادتی عدل وتوازن کی ایک شکل ہوتی ہے جس کے بغیر معتدل زندگی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ تاریخ اسلامی کی اکثر انقلابی تحریکات میں اس کا اثر دیکھا جاسکتا ہے۔مولانا امینیؒ نے اس اصول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''فقہاء نے مذکورہ اصول کے ذریعہ عدل وتوازن کے مسئلہ کو بڑی دقیقہ رسی اور نکتہ سنجی سے حل کیا اور ہر حالت کے مناسب وسعت وتنگی کی گنجائش رکھی ہے۔اس حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے فقہ کی بہت سی جزئیات میں دشواری نظر آتی اور بعض مسائل بالکلیہ موجودہ حالات کے مناسب نہیں معلوم ہوتے ہیں۔''(۵۴)

(۶) الحرج مرفوع(۵۵) ''حرج اٹھالیا گیا ہے''۔

حرج کی اصل تنگی ہے' اس لیے جو مشقتیں عادۃً روزانہ کے کام کاج میں ہوتی ہیں وہ لغوی اور شرعی اعتبار سے حرج میں داخل نہ ہوں گی ۔ چنانچہ وہ امور جن میں تنگی اور رکاوٹ ہوگی شرعی لحاظ سے فقہاء نے ان میں آسانی پیدا کرنے کی غرض سے یہ اصول پیش کیا ہے۔مولانا امینیؒ نے اس اصول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اسلام کی نظر میں اصل چیز زندگی میں عدل وتوازن اور معاشرہ میں ہمواری ہے۔اس کے لیے طریقہ کار کیا اختیار کیا جائے' اس پر اس نے زیادہ زور نہیں دیا' بلکہ انسان کی نفسیاتی اور مزاجی کیفیت کے پیش نظر اونچی اور نیچی حد کی متعین پر اکتفا کیا ہے۔اس اجازت سے اگر ہر مقام اور ہر حالت میں کام لیا گیا تو زندگی میں عدل وتوازن باقی نہ رہے گا اور اگر ہر حالت اور ہر مقام سے اس کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی تو یہ حرج (تنگی) کی صورت ہوگی جس کا نتیجہ جنسی آوارگی کی شکل میں ظاہر ہوکر پورے معاشرہ کو تباہ کردے گا.....حالات ومقامات کا صحیح تجزیہ کرنا آسان نہیں ہے' ہر دور کا یہ مشکل ترین کام سمجھا گیا ہے۔اس کو سمجھے بغیر فراخی اور تنگی کا فیصلہ دشوار ہے۔''(۵۶)

(۷) الاصل فی الاشیاء الاباحة (۵۷) ''اشیاء میں اصل اباحت ہے''۔

یہ اصول اصل میں اس حقیقت کے اظہار کے لیے وضع کیا گیا ہے کہ تمام اشیاء خالق کائنات نے انسان کے فائدے کے لیے پیدا کی ہیں۔اگر ان کو ان کے فطری حدود کے اندر استعمال کیا جائے تو کائنات کی ہر چیز مباح ومفید ہے' لیکن انسان خود ان کو بگاڑ کر اپنے لیے مضر بنالیتا ہے۔مثال کے طور پر انگور کو لیجیے۔اس کے اندر خدا نے کتنی لذت ولطافت رکھی ہے۔اس کے حلال ومباح ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہے۔مگر جب اس انگور کو انسان نے بگاڑ کر شراب بنالی تو خدا نے اس کو حرام کردیا لیکن انگور کی حلت برقرار رہی۔اس لیے کہ حکم ہمیشہ علت پر لگتا ہے اور جو علت شراب کی ہے یعنی نشہ وہ انگور میں نہیں اس لیے انگور حلال ہے۔غرض یہ کہ حقیقت میں ہر چیز مباح ہے۔جبکہ انسان اسے اپنے استعمال سے حرام اور مضر بناتا ہے۔

چنانچہ جن امور کے بارے میں حلال اور حرام کی تصریح موجود ہے ان میں اشتباہ کا سوال ہی پیدا نہیں

ہوتا۔ البتہ جن کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ موجود نہ ہو اور قوی دلیل کی بنا پر کسی ایک سمت کو ترجیح نہ حاصل ہو سکے ایسی صورت میں مذکورہ اصول سے کام لے کر اس کی اباحت کا حکم دیں گے۔ گویا اس اصول سے ناجائز فائدہ اٹھا کر حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے اس اصول کے استعمال میں فقہاء نے بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ اس بنا پر بعض فقہاء نے اشیاء میں اصل حرمت کو قرار دیا ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا امینیؒ لکھتے ہیں کہ:

''حلّت محض ضرورت کی بنا پر ہے' اس لیے ضرورت ہی کے لحاظ سے اس میں وسعت و تنگی ہے۔ انسان کی نفسیاتی' معاشی اور سماجی زندگی کبھی وسعت سے کام لینے پر مجبور ہوتی ہے اور کبھی اس کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ حالات کا تقاضا یکساں نہیں ہوتا۔''(۵۸)

خلاصہ بحث یہ کہ مولانا امینیؒ نے فقہ اسلامی کی تشکیل جدید کے حوالے سے جو کچھ محنت کی ہے اور اس حوالے سے جن اصول و قواعد اور مصالح و مقاصد کی نشان دہی کی ہے' ان پر سنجیدگی سے غور و فکر کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان اصولوں سے عملی استفادے کی راہیں نکالی جائیں اور جدید مسائل کے حل کے حوالے سے ان اصولوں سے فائدہ اٹھا کر فقہ کی تشکیل جدید کا اہم کام پورا کرنے کی طرف پیش رفت کی جائے۔ یقیناً مولانا کی معروضات سے اختلاف کی مکمل گنجائش موجود ہے مگر اس حوالے سے تنقیدی امور کی نشان دہی کر کے ہی تعمیری امور کی جانب قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات

(۱) ندوی' مجیب اللہ' اجتہاد اور تبدیلی احکام' چراغ راہ (اسلامی قانون نمبر)' کراچی' ج ۲' ص ۱۵۷

(۲) امینی' محمد تقی' اجتہاد' قدیمی کتب خانہ' کراچی' ص ۲۶۴

(۳) امینی' محمد تقی' اسلام اور جدید دور کے مسائل' قدیمی کتب خانہ' کراچی' ص ۶۵

(۴) مرجع سابق' ص ۷۳۔۷۲

(۵) امینی' محمد تقی' احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت' الفیصل ناشران و تاجران کتب' لاہور' ص ۴۲

(۶) مرجع سابق' ص ۳۹

(۷) امینی' محمد تقی' اسلام اور جدید دور کے مسائل' ص ۴۷

(۸) امینی' محمد تقی' احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت: ص ۳۶

(۹) مرجع سابق' ص ۲۱

(۱۰) امینی' محمد تقی' احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت' ص ۲۶ تا ۳۶

(۱۱) الترمذی' محمد بن عیسیٰ' الجامع الترمذی (الکتب الستہ)' دارالسلام للنشر والتوزیع' الریاض' ۱۹۹۹ء' ص ۸۵۲

(۱۲) البخاری' محمد بن اسماعیل' الجامع الصحیح (الکتب الستہ)' دارالسلام للنشر والتوزیع' الریاض' ۱۹۹۹ء' ص ۴۴۲

(۱۳) الخطیب' ولی الدین محمد بن عبداللہ' المشکاۃ المصابیح' دارالنفائس' بیروت' ۲۰۰۳ء' ص ۴۳۵

(۱۴) امینی' محمد تقی' احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت' ص ۱۲۵۔۱۲۴

(۱۵) القشیری' مسلم بن حجاج' الجامع الصحیح (الکتب الستہ)' دارالسلام للنشر والتوزیع' الریاض' ۱۹۹۹ء' ص ۵۶۵

(۱۶) البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح (الکتب الستہ)، ص۳۳۴
(۱۷) القزوینی، محمد بن یزید، السنن لابن ماجہ (الکتب الستہ)، دارالسلام للنشر والتوزیع، الریاض، ۱۹۹۹ء، ص۱۷۹۰
(۱۸) مرجع سابق، ص۱۸۹۱
(۱۹) البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح (الکتب الستہ)، ص۴۹۲
(۲۰) الخطیب، ولی الدین محمد بن عبداللہ، المشکاۃ المصابیح، ص۲۱۴
(۲۱) مرجع سابق، ص۲۱۵
(۲۲) نسائی، احمد بن شعیب، السنن (الکتب الستہ)، دارالسلام للنشر والتوزیع، الریاض، ۱۹۹۹ء، ص۱۲۳۸
(۲۳) الترمذی، محمد بن عیسیٰ، الجامع الترمذی (الکتب الستہ)، ص۹۵۲
(۲۴) امینی، محمد تقی، احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت، ص۱۳۶
(۲۵) ابن القیم الجوزیہ، اعلام الموقعین، دارالجیل، بیروت، ۱۹۷۳ء، ج۲، ص۲۱۵
(۲۶) امینی، محمد تقی، احکامِ شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت، ص۱۷۲
(۲۷) ابن نجیم، البحر الرائق، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ، ج۲، ص۳۴۳
(۲۸) امینی، محمد تقی، احکامِ شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت، ص۱۷۴
(۲۹) ابن القیم الجوزیہ، اعلام الموقعین، ج۱، ص۱۴۲
(۳۰) امینی، محمد تقی، احکامِ شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت، ص۱۷۷
(۳۱) الآمدی، الاحکام فی اصول الاحکام، دارالصمیعی، سعودیہ عرب، ۲۰۰۳ء، ج۳، ص۴۴۳
(۳۲) محمد طنطناوی، نظام العالم والامم، دارالعلم، بیروت، ۱۹۸۸ء، ج۲ء، ص۱۴۳۔۱۴۴
(۳۳) امینی، محمد تقی، احکامِ شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت، ص۱۷۸
(۳۴) محمد بن صالح العثیمن، شرح الاصول من علم الاصول، دارالبصیرہ، مصر، ج۱، ص۵۳۲
(۳۵) امینی، محمد تقی، اسلام اور جدید دور کے مسائل، ص۱۰۳
(۳۶) الآمدی، الاحکام فی اصول الاحکام، ج۲، ص۱۴۲
(۳۷) ابن نجیم، البحر الرائق، ج۲، ص۴۳۲
(۳۸) امینی، محمد تقی، احکامِ شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت، ص۲۰۸۔۲۰۹
(۳۹) الشاطبی، اسحاق بن ابراہیم، الموافقات، دارابن عفان، بیروت، ج۲، ص۱۳۲
(۴۰) امینی، محمد تقی، احکامِ شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت، ص۲۱۵۔۲۱۶
(۴۱) الشاطبی، اسحاق بن ابراہیم، الموافقات، ج۲، ص۴۲۲
(۴۲) امینی، محمد تقی، احکامِ شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت، ص۲۲۶۔۲۲۷
(۴۳) ندوی، علی احمد، ڈاکٹر، القواعد الفقہیہ، دارالقلم، دمشق، ۱۹۸۶ء، ص۲۰۱
(۴۴) امینی، محمد تقی، فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ص۲۳۹
(۴۵) قرافی، ابوالعباس شہاب الدین، انوار البروق فی انوار الفروق، دارعالم الکتب، بیروت، ج۱، ص۴۳
(۴۶) امینی، محمد تقی، فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، ص۲۶۶

(۴۷) ندوی، مجیب اللہ، اجتہاد اور تبدیلی احکام، چراغ راہ (اسلامی قانون نمبر)، ج ۲، ص ۱۷۶
(۴۸) الشاطبی، اسحاق بن ابراہیم، الموافقات، ج ۲، ص ۳۱۱
(۴۹) ندوی، علی احمد، ڈاکٹر، القواعد الفقہیہ، ص ۲۸۱
(۵۰) امینی، محمد تقی، فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، ص ۳۰۶
(۵۱) سبکی، تاج الدین عبدالوہاب، الاشباہ والنظائر، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۹۱ء، ج ۱، ص ۱۹۱
(۵۲) امینی، محمد تقی، فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، ص ۲۸۳
(۵۳) ابن نجیم، البحر الرائق، ج ۲، ص ۱۶۶
(۵۴) امینی، محمد تقی، فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، ص ۲۷۷
(۵۵) قرافی، ابوالعباس شہاب الدین، انوار البروق فی انوار الفروق، ج ۱، ص ۷۳
(۵۶) امینی، محمد تقی، فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، ص ۲۵۳
(۵۷) ندوی، علی احمد، ڈاکٹر، القواعد الفقہیہ، ص ۲۹۹
(۵۸) امینی، محمد تقی، فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، ص ۲۹۳

❁❁❁

بقیہ: اسلامی برادری کے باہمی تعلقات

اسی طرح جس نے قرض دیا ہے وہ مقروض پر سختی نہ کرے بلکہ نرمی کے ساتھ تقاضا کرے۔ یہ طرزِ عمل بہت پسندیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کی صرف اس بات پر نجات کر دی کہ وہ اور اس کے کارندے مقروضوں کے ساتھ نرمی اختیار کرتے تھے اور اگر کوئی شخص مالی حالت کی کمزوری کی بنا پر رقم واپس نہ کر سکتا تو یہ شخص اس سے تقاضا نہ کرتا بلکہ رقم معاف کر دیتا۔

ہر شخص چاہتا ہے کہ اسے اہمیت دی جائے اور بروقت اس کی امداد کی جائے۔ اس لیے اچھا انسان وہ ہے جو دوسروں کو نفع پہنچانے میں لگا رہے اور یہ بہت بڑی نیکی ہے۔ باجماعت نماز میں پہلی صف میں کھڑے ہونے کا بڑا ثواب ہے۔ اگر کوئی نمازی کسی دوسرے آنے والے کا اکرام کرتے ہوئے پہلی صف سے نکل جائے اور اسے پہلی صف میں جگہ دے دے تو ایسا شخص اگرچہ پہلی صف کی بجائے دوسری صف میں کھڑا ہو جائے گا مگر اسے پہلی صف میں کھڑے ہونے والے سے دوگنا ثواب ملے گا، کیونکہ اس نے اپنے مسلمان بھائی کو ترجیح دی ہے۔

اگر انسان کی روزی مشکوک ہو تو اسے اس کی فکر کرنی چاہیے، کیونکہ ناجائز کمائی سے تیار کیے ہوئے کپڑے پہن کر نماز جیسی عبادت بھی مسترد کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ اپنے عزیز و اقارب اور قریبی دوستوں کو سنجیدگی کے ساتھ رزقِ حلال کی تلقین کرنا چاہیے اور خود اس پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔

پسندیدہ اور ناپسندیدہ کاموں کی فہرست بڑی لمبی ہے اور ہر شخص کو معلوم ہے۔ پس ہر وقت اللہ تعالیٰ سے اچھے کاموں کی توفیق اور برے کاموں سے بچنے کی دعا کرنا چاہیے اور اپنے تعلق داروں کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوئے انہیں بھی اس بات کی تلقین کرنا چاہیے۔ یہی اس حدیث کا تقاضا ہے اور نبی اکرم ﷺ نے بھی ہمیں آپس کے باہمی تعلقات اور برتاؤ کے بارے میں اسی قسم کی ہدایات دی ہیں۔ ❁❁❁

اسلام اور مسلمانوں کو درپیش موجودہ چیلنجز؟

جناب احمد جاوید کی گفتگو (دوسری نشست)

☆

پچھلی نشست میں یہ ذکر ہوا تھا کہ ایمان اگر شعور کا واحد مرکز بن جائے تو ایمانی ذہن سے طرح طرح کے علوم پیدا ہوتے ہیں' چاہے وہ علوم بظاہر دُنیوی ہی کیوں نہ ہوں۔ ہمیں مخلوقات کے تجزیئے اور مخلوقات کی خلقی بناوٹوں کو جاننے کے لیے' نیز دنیا جس فطری یا نظریاتی نظام پر چل رہی ہے' اُس نظام پر دسترس حاصل کرنے کے لیے اگر ایمانی شعور کی قیادت اور فیصلہ کن رہنمائی نصیب ہو تو دنیا کے بارے میں بھی مضمون وہ نہیں رہیں گے جو آج ہم پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ ایمانی ذہن سے پیدا ہونے والی سائنس وہ سائنس نہ ہوتی جو آج مسلّط ہے۔ اسی طرح اس ذہن نے اپنی ذمہ داری اچھی طرح ادا کی ہوتی تو معاشی علوم یعنی انسانی معیشت کو چلانے ولا ایک عالمگیر نظام' اپنے اصول اور مظاہر کے ساتھ یہ نہ ہوتا جو آج ساری دنیا میں مروج ہے۔ غرض یہ کہ علم کی کوئی بھی قسم ایمان سے لاتعلق نہیں رہ سکتی۔ ایمان کہتے ہیں شعور کے اُس بنیادی مسلّمہ کو جو میرے جاننے اور ماننے کی تمام حالتیں اور ضرورتیں طے کرتا ہے اور مجھے جاننے کے لیے راستے اور دروازے فراہم کرتا ہے اور جو حِسّی طور پر ذہن میں آجانے والی چیزوں کو معنی دیتا ہے۔ علم کا مطلب ہے محسوسات کو معنی دینا۔ دُنیوی علم یہ ہوتا ہے کہ حواس کے ذریعہ سے جو چیزیں ہمارے ذہن تک پہنچتی ہیں تو ذہن اُن چیزوں کو آپس میں مربوط کرتا ہے اور اُنہیں معنی دیتا ہے اور اُنہیں حواس سے باہر موجود حقائق کو سمجھنے کا ذریعہ بناتا ہے۔ یہ ہے دنیوی علوم کے بارے میں ذہن کی ساخت۔ تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک شعور اپنے مرکز کے ساتھ زندہ تعلق رکھتا ہو اور اپنے بنیادی مسلّمہ کے ساتھ سنجیدہ اور صادق ہو تو وہ محسوسات کو معنی نہ دے..... ایسے معنی جن کی تصدیق ایمانی شعور سے ہوتی ہو۔ تو ایمان کا تقاضا اور ایمان کی بنیاد پر ہمارے ذہنوں پر وارد ہونے والا فریضہ یہ ہے کہ ہماری تمام ''معلومات وعلوم'' یہ سب کچھ جو ہیں وہ اپنے معنی میں ایمانی شعور سے متصادم نہ ہوں' بلکہ اُس کی تصدیق حاصل کریں۔ مردِ مؤمن کا کام ہی یہ ہے کہ وہ اپنے تمام علوم میں ایمان کی تصدیق حاصل کرنے میں کامیاب رہتا ہے۔ تو اللہ کو غیب میں رہتے ہوئے ماننے کا فطری تقاضا یہ ہے کہ اللہ کو غیب میں رہتے ہوئے ماننے کی حالت کو ہم شہود کے ساتھ اپنے ذہنی اور اخلاقی' دونوں طرح کے تعلقات پر حاکم بنا کر نافذ رکھیں گے۔ تو ہمارے اجتماعی مسلم ذہن نے ایمان کی اس انتہائی نازک' انتہائی بڑی اور فطری ذمہ داری ادا کرنے میں کسل کا مظاہرہ کر کے غیر ذمہ داری کا ارتکاب کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ایمان رفتہ رفتہ ہمارے لیے عقل کو تسکین پہنچانے والے اور اخلاق میں طمانیت کا

☆ یہ گفتگو قرآن اکیڈمی لاہور میں تین روزہ ''تدریب الاساتذہ کورس'' میں دو نشستوں میں وقوع پذیر ہوئی۔

رنگ پیدا کرنے والے امر کی حیثیت سے کمزور پڑتا جا رہا ہے۔

اس گفتگو کا جو پہلا حصہ ہے کہ ایمان کو مرکز شعور کیسے بنایا جائے تو اُس کا بالکل ایک سادہ سا نسخہ ہے۔ اگر اُس کو اخلاص' صداقت' استقامت اور محنت کے ساتھ اختیار کرلیا جائے تو ان شاء اللہ' ایمان کا مرکز شعور ہونا میرے لیے میرے ذہن میں establish ہو جائے گا اور میرے لیے لائقِ اِدراک اور قابلِ احساس ہو جائے گا۔ یعنی میں محسوس کرنے کے لائق ہو جاؤں گا کہ بحمدِ اللہ ایمان میرا مرکزِ شعور ہے۔ مرکز شعور ہونے کا مطلب میں عرض کر چکا ہوں کہ' تمام علوم میں اُس کا حاکمانہ تصرف ہو' اُس کی مصدقانہ شان ہو' ہر علم ایمان کے تابع ہو' ہر علم ایمان سے تصدیق یافتہ ہو —— اس امکان کے باوجود کہ یہ علم غلط اور صحیح ہوسکتا ہے۔ دُنیوی علم ایمان کا جزو نہیں بنتا۔ یہ ایمان میں صرف تقویت یا کمزوری کا سبب بنتا ہے۔ تو ایک آدمی اپنے تمام دنیوی علوم کو' اپنے تخیلات وتصورات کو' چیزوں کے بارے میں اپنے آزاد نظریات کو' اگر اپنے ایمانی شعور سے مطابقت کی حالت میں رکھنے میں کامیاب ہے تو گویا اُس نے ایمان کو اپنا مرکز شعور بنا لینے میں کامیابی حاصل کرلی۔ تو اُس کا آسان حل جو میں عرض کر رہا تھا یہ ہے کہ ''تم جو جانتے ہو اُس جاننے کے ذہنی نتائج بھی ایمان کے ذہنی مسلّمہ کے برخلاف نہیں ہونے چاہئیں۔ اور جو کچھ بھی جانتے ہو اُس کے اثرات بھی ایمان کے اخلاقی مطالبات کے برخلاف نہیں ہونے چاہئیں۔''

میرا ہر چیز سے تعلق دو بنیادوں پر ہے۔ ایک بنیاد یہ ہے کہ اس چیز کا علم میرے علم توحید سے ٹکراؤ نہ پیدا کرے اور دوسرے یہ کہ اس چیز کے ساتھ تعلق اور اسے استعمال میں لانے کا اثر میرے اندر کسی اخلاقی بگاڑ کی وجہ نہ بنے۔ یعنی میری بندگی میں نقص نہ پیدا کرے۔ تو جو شخص اس مستقل تناظر (perspective) کو اہتمام کے ساتھ برقرار رکھنے اور حاضر دماغی کے ساتھ محفوظ رکھنے پر قادر ہو جائے تو وہ ان شاء اللہ ایمان کو مرکزِ شعور اور مرکزِ وجود بنا لینے میں ضرور کامیاب ہوگا۔ بس اس شرط کو ہر حال میں' ہر موقع پر' ہر قدم پر پورا کرنا ہے' کہ اس چیز سے ذہنی اور عملی تعلق میرے ایمان کے لیے ضرر تو نہیں رکھتا ہے اور ایمان سے براہ راست متبادر ہونے والے اخلاقی وجود کے لیے خطرے کا باعث تو نہیں ہے؟ ان دو سوالات سے گزرے بغیر کسی چیز کو جاننے اور اُسے استعمال میں لانے کا عمل شروع کرنا بھی گویا شرک ہے۔ اس سوال کو جو شخص اپنی شخصیت پر اور ذہن پر مسلط رکھتا ہے' حاضر رکھتا ہے' اپنے اوپر حاکم رکھتا ہے..... گویا کسی چیز کو نہیں دیکھوں گا اُس کے خالق کو دیکھے بغیر' میں کسی چیز کو نہیں مانوں گا اُس کے خالق کو مانے بغیر..... تو پھر ان شاء اللہ تناظر بدل جائے گا۔ چیزوں کے بارے میں جب آپ کا بنیادی تناظر بدل جاتا ہے تو اُس چیز سے حاصل ہونے والے علم کے دلائل بھی بدل جاتے ہیں' مقاصد بھی بدل جاتے ہیں اور اُس کی صورت اور معنویت بھی بدل جاتی ہے۔ تو اسی وجہ سے میں عرض کر رہا تھا کہ یہ ہماری کوتاہی کی وجہ سے ہوا ہے کہ آج دنیا کو سمجھنے والے اور دنیا کو بنانے یا بگاڑ سکنے والے تمام علوم غیر ایمانی ذہن سے پیدا ہوئے ہیں اور ایمانی دماغ کو اُنہیں جبراً سیکھنا پڑ رہا ہے۔ میرے اندر علم کی تشکیل کا کوئی بھی زاویہ ایسا نہیں جسے میں اعتماد سے ایمانی کہہ سکوں۔ میرے ذہن میں میرے علم کی تشکیل کا سارا عمل موجودہ مغربی منطق' تصورِ علم' تصورِ شے' اور تصورِ زندگی سے پیدا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم ایک بھیانک عالمگیر جبر میں مبتلا ہیں اور اُس

سے نکلنے کا اہتمام اب بھی نہ کرنا یہ اللہ تعالیٰ سے بے وفائی اور دینی بے حمیّتی ہوگی۔ ایمان کا یہ تقاضا ہے کہ جو تمہارے وجود میں ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے' اللہ کے لیے ہے۔ جو تمہارے شعور میں ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے' اللہ کے لیے ہے۔ اس میں صادق بن کر دکھاؤ۔ جب تم کہتے ہو کہ بگ بینگ (big bang) سے کائنات پیدا ہوئی ہے تو کبھی کوشش کی کہ بگ بینگ کو اپنے ایمان کی کسوٹی پر پرکھ کر دکھا دو؟ اس کے اقرار کو بھی مدلل بنا دو' اس کے انکار کو بھی مدلّل بنا دو۔ یہ بائیولوجیکل ایوولیوشن (biological evolution) کا ڈارون کا جو نظریہ ہے اس پر کوئی ایمانی موقف اختیار کیا گیا ہے؟ کیا ہم نہیں جانتے کہ بگ بینگ ہو' اضافیت ہو یا ارتقاء ہو' ان سب کی وجہ سے ایک عالمگیر انسانی ذہن کی صورت گری ہو چکی ہے؟ یعنی ایک عالمگیر اجتماعی ذہن ہے' جس کی ان تین تھیوریز نے صورت گری کر دی ہے' تکمیل کر دی ہے' تشکیل کر دی ہے اور اُس کے ذہن کا مزاج بنا دیا ہے۔ تو اس طرح کے ماحول میں رہتے ہیں اور ہم اپنے اوپر حکومت کرنے والے نظریات کو اپنے ایمان کی کسوٹی پر پرکھنے کی اہلیت تو دور کی بات ہے' میرا گمان ہے کہ خواہش بھی نہیں رکھتے۔

مثال کے طور پر سائنس کسے کہتے ہیں؟ سائنس کہتے ہیں چیزوں کا ایسا تجزیہ جو اُن کے جوہرِ واحد یعنی prime substance تک پہنچا دے اور اُنہیں ایک دوسرے سے متعلق رکھنے والے مستقل جو نظام ہیں اُن تک ہمیں رسائی دلا دے۔ سائنس کا مطلب ہے مادے کا تجزیہ' تاکہ ہر چیز کا مادی ہونا مربوط ہو جائے' متحد الاصل ہو جائے۔ تو کبھی ہم نے غور کیا ہے کہ سائنس اپنے ایجنڈے میں ۱۰۱ فیصد کامیاب ہے۔ یعنی اپنے اصولِ علم کو اپنے علوم کی تشکیل کی بنیاد بنا لینے میں ماڈرن سائنس یا کوئی بھی سائنس ۱۰۱ فیصد کامیاب ہے۔ یہ اپنے بنیادی مقصد کو اپنے کسی بھی نظریہ تک پہنچنے میں کسی رکاوٹ کا لحاظ نہیں کرتی اور اس چیز کو ہمیشہ ملحوظ رکھتی ہے کہ مجھے چیزوں میں ایک قابلِ دریافت empirical حسی وحدت درکار ہے' جس کے dynamism کی وجہ سے نظامِ فطرت اور نظامِ ہستی چل رہا ہے۔ تو اسی طرح اور دیگر علوم اور اُن اصولوں کے ساتھ وہ وفادار ہیں۔ اسی وجہ سے اُن علوم میں ایک عالمگیریت کا وصف پیدا ہوا۔ اب دیکھیں کہ مغرب نے جتنے علوم پیدا کیے وہ اپنی پیدائش سے چھ ماہ بعد عالمگیر حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور وہ سارے علوم ذہن کو اللہ سے نامانوس کر دینے والے ہیں اور اس میں مغرب کامیاب ہوا۔ خصوصاً مغربِ جدید کا تخلیق کیا ہوا ہر علم چاہے وہ نظریے میں ہو' چاہے وہ تجربے میں ہو' چاہے وہ جمالیات میں ہو' کسی بھی پہلو سے اگر وہ اُن کی یونیورسٹیوں میں آ گیا ہو' تو وہ علم عالمگیر بن کر رہتا ہے' وہ علم معیار بن کر رہتا ہے۔ اُن کے بتائے ہوئے اصول و مقاصدِ علم عالمگیر حیثیت رکھتے ہیں اور اس حالت میں عالمگیر ہیں کہ ذہن کو خدا سے نامانوس کر رہے ہیں۔ وہ ذہن کے لیے خدا کے تصور کو اجنبی بنا رہے ہیں۔ اقرار اور انکار کی جو classical بحث تھی وہ اب پیچھے رہ گئی ہے۔ اب وہ ذہن میں سے خدا کی جگہ خالی کروا رہے ہیں۔ خدا کے وجود کا بظاہر انکار کیے بغیر اُن کے پیدا کیے ہوئے خدا دشمن علوم ہمارے نظامِ تعلیم کی بنیاد ہیں' ہمارے سوچنے کے انداز کی بنیاد ہیں' ہماری ذہنیت کی تشکیل کی بنیاد ہیں۔ تو اُس میں اگر ہم اپنے ایمان کو حکم بنانے کے اہم فریضے سے غافل ہیں تو اس کی تلافی کوئی اور activity نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری اجتماعی اثرات ڈالنے والی کوئی بھی activity بہترین حضرات کی موجودگی کے باوجود ناکام رہتی

ہے۔اس کی کوئی تو وجہ ہوگی نا کہ بہترین حضرات ایک تحریک چلاتے ہیں' علمی دنیا میں کوئی کارنامہ انجام دیتے ہیں' لیکن اُن سب کی عمر بہت چھوٹی ہوتی ہے۔اول تو وہ کامیاب نہیں ہوتے اور اگر ہو بھی جائیں تو تھوڑے وقت کے لیے ہوتے ہیں۔

اس کا سبب یہ ہے کہ جو سب سے پہلی qualification ہے ہر دینی کام کرنے کی' چاہے وہ دینی کام نفس کا تزکیہ ہو' خواہ وہ تزکیہ عالم کا ہو' تو اس طرح کے کاموں کی بنیاد اس بات پر ہے کہ ایمان کو مرکز شعور و وجود بنا لینے میں کوئی کامیابی ہوتی ہے یا نہیں؟ اگر اس طرح کی تربیت پائے ہوئے لوگ نہ ہوں گے اور ایمان کو کسوٹی بنا لینے میں کامیاب ہو جانے والا ایک trend اور چلن ہمارے اندر پیدا نہیں ہوگا تو اُس وقت تک ایمان کے دیگر عملی مطالبات کی تکمیل کا ہر راستہ ہم پر بند رہے گا۔ایمان کے علمی مطالبے کی تکمیل کیے بغیر ایمان کے عملی تقاضے کی تکمیل محال ہے... large scale پر کہہ رہا ہوں۔تو مختصر یہ کہ یہ ایمان کا مرکز شعور ہونا ہے۔

ایمان کا مرکز وجود ہونے کا مطلب یہ ہے کہ میرا ارادہ اور میری پسند ناپسند' اور زندگی کے بارے میں میری رغبت و کراہت کا پورا نظام اور اس نظام سے بننے والے دائرہ کا مرکز ایمان کو ہونا چاہیے۔ہر آدمی طبیعت اور ذہن کا ایک دائرہ رکھتا ہے۔اُس دائرے کا کوئی نہ کوئی مرکز ضرور ہوتا ہے۔کوئی شخص اس دائرے سے خالی نہیں.....کوئی شخص اس دائرے کے مرکز سے عاری نہیں ہے۔لیکن ہر شخص کے مرکز الگ الگ ہوتے ہیں۔تو اللہ چاہتا ہے کہ اُس مرکز کو ہم ایمان پر بنائیں۔تو وجود میں ایمان کا مرکزی حیثیت اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ میرا اخلاقی وجود' میرے طبعی مرغوبات و مکروہات' اور میرے ارادوں کو تشکیل دینے والے محرکات' یہ سب ایمان کے تابع ہونے چاہئیں.....یعنی یہ بندگی کے رنگ میں رنگے ہونے چاہئیں۔

اس علم میں معرفت حاصل ہوتی ہے جس میں اللہ کا شعور بندگی کے وقوف پر غالب ہوتا ہے۔اور عملی وجود میں ایک ایسی حالت ہوتی ہے جس میں بندگی کا احساس اللہ کے حضور کی جگہ لے لیتا ہے۔یعنی بندگی کا احساس ہی اللہ کا حضور ہے اور اللہ کی معرفت ہی بندگی کی حقیقت کی پہچان حاصل کرنے کا واحد حقیقی ذریعہ ہے۔تو یہ ایمان کا مرکز شعور ہونا ہے۔تو اس میں جو کرنے کے کام ہیں وہ محنت سے' سنجیدگی سے' یکسوئی سے' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ پر نثار ہو جانے کے جذبے سے کرنے ہیں۔وہ جذبہ نہیں پیدا ہوگا تو پھر اللہ کے کام ہو ہی نہیں سکتے۔اور اس کی بہت ضرورت ہے۔اور ہمیں کوئی بڑے لمبے چوڑے نصاب کی ضرورت نہیں ہے۔ذہن کتابوں سے نہیں بدلتا' ارادے سے بدلتا ہے۔اُس میں بس ایک ارادے اور نیت کی ضرورت ہے کہ نہیں مانوں گا کوئی ایسی چیز جو اللہ کے ماننے میں مدد نہ دے۔نہیں جانوں گا کوئی ایسی چیز جو اللہ کی معرفت میں تقویت نہ پہنچائے۔نہیں طلب کروں گا کوئی ایسی چیز جس میں مطلوبِ حقیقی اللہ نہ ہو۔نہیں پسند کروں گا کوئی ایسی چیز جو اللہ کو ناپسند ہو۔بس یہ ہے! یہ اگر ہو گیا تو اُس کو آپ عنوان دے سکتے ہیں کہ ایمان مرکز شعور بھی ہے اور اللہ کے فضل سے اللہ کی مہربانی سے' مرکزِ وجود بھی بن گیا ہے۔لیکن کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم لوگ ایک بڑا فیصلہ کر کے اُٹھیں۔اور ظاہر ہے کہ فیصلہ کرنا تو مجھ جیسے لوگ آپ حضرات سے سیکھیں گے۔آپ حضرات میں استقامت ہے' فیصلے کی طاقت ہے' ایثار کی قدرت ہے' جو مجھ میں یا مجھ جیسے لوگوں میں نہیں ہے۔لہٰذا ایک بڑا فیصلہ کر لیں

—— یہ کہ میں جو جانتا ہوں‘ ایمان سے اُس کی تصدیق کرواؤں گا—— میں جو چاہتا ہوں تعلق مع اللہ سے اُس کی سند لوں گا۔ بس ہو گیا!

ایمان باللہ شعور کا مرکز ہے اور تعلق مع اللہ وجود کا حاصل ہے۔ اس کا تجربہ کر کے دیکھیں اور یہ کرنے کے لیے اگر کچھ مشق کی ضرورت ہے تو اُس کے لیے آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم کوئی text‘ کوئی خیال‘ کوئی بات لے کر اُس کو گزارتے ہیں ایمان کی کسوٹی پر۔ نہ صرف یہ کہ اُس کا کھوٹا کھرا ہونا سمجھنے کے لیے بلکہ یہ کہ اگر اُس میں کھوٹ ہے تو اس کھوٹ کو زائل کیسے کیا جائے؟ اُس کی کوشش کرنے کے لیے بھی۔

گفتگو کے اختتام پر اس موضوع سے دور کی مناسبت رکھنے والا ایک سوال ہے‘ کہ مثال کے طور پر شاہ ولی اللہؒ تھے‘ شاہ عبدالعزیزؒ تھے اور پھر ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ تھے۔ ڈاکٹر اسرار صاحبؒ کو اکثر لوگوں نے دیکھا ہوا ہے‘ سنا ہوا ہے۔ تو اس وجہ سے اُن کا نام لے رہا ہوں کہ لوگ اُن سے مانوس ہیں‘ گواہ بن سکتے ہیں: کہ دیگر علماء حضرات اور کثیر مذہبی لوگوں کے مقابلے میں ڈاکٹر صاحبؒ کو‘ اُن تمام پر کیا امتیاز حاصل تھا؟ اس کا جواب ہی اس پچھلی گفتگو کو ایک دم سے بامعنی بنا دے گا۔

آپ کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے اپنے امتیازات ہیں۔ دنیا کا بہت علم رکھتے تھے۔ دنیا اور تاریخ‘ سائنس‘ ادبیات‘ اور دنیا کو بنانے والے قانون کا علم رکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے ہر علم کو ایمان کی کسوٹی پر پرکھو‘ اور بڑھکیں مت مارو۔ عاجزانہ انداز سے اپنی بات کہہ دو۔ ڈاکٹر صاحب کا مزاج صحابیانہ تھا! مطلب یہ کہ صرف ایک discourse بنا سکنے والی ذہنی قابلیت تو تھی اُن میں جو شاذ (rare) ہے۔ لیکن یہ کہ وہ اللہ سے بہت وفادار تھے۔ صاحبِ استقامت تھے‘ جذبہ استقامت بہت تھا۔ تو زیادہ تر لوگوں کو اُن کی باتوں سے زیادہ اُن کا جذبہ استقامت متاثر کرتا تھا۔ کبھی آپ اپنے تاثرات کو جانچ کر دیکھیں تو پتا چل جائے گا کہ ڈاکٹر صاحب کی زبان سے نکلی ہوئی بات نے اثر کیا‘ لیکن اُن کو دیکھنے سے‘ اُن سے جذبہ استقامت کی شعاعیں اُبل اُبل کر جو مجھ تک پہنچ رہی تھیں اُنہوں نے مجھے زیادہ متاثر کیا۔

تبلیغی جماعت کے بانی مولانا الیاسؒ ہکلے تھے۔ وہ گفتگو ٹھیک طرح سے نہیں کر سکتے تھے۔ آپ دیکھیں کہ جو شخص بیمار ہو‘ گفتگو کا فن نہ جانتا ہو‘ شخصیت بھی غیر متاثر کن ہو‘ تو اُنہوں نے دنیا کی سب سے بڑی دعوت کی جماعت بنا کر دکھا دی۔ اُن کی زندگی میں ہی یہ جماعت دنیا کی سب سے بڑی دعوت کی جماعت بن گئی۔ عیسائیوں کی سالویشن آرمی سے بڑی ہے۔ سالویشن آرمی کا بجٹ پاکستان کے بجٹ کے برابر ہے۔ اُس سے بڑی جماعت بنا کر دکھائی دی اُس ایک آدمی نے جسے تقریر کرنا آتا ہی نہ تھا۔ تو اسی وجہ سے اُن کے بارے میں کسی کا فقرہ ہے کہ جماعت صحابہ میں سے ایک آدمی پیچھے رہ گیا اُسے ہم نے دیکھ لیا۔

❁❁❁

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا

تفہیم القرآن میں تقابلِ ادیان

عظمیٰ خاتون فلاحی ☆

اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ''قرآن مجید'' کی علمائے دین نے مختلف تفسیریں لکھی ہیں' تاکہ خدا کے بندوں کو خدا کے دین سے زیادہ سے زیادہ قریب آنے میں مدد دیں۔ان میں سے ہر ایک نے توفیقِ الٰہی کے مطابق قرآنی آیات کی توضیح وتفسیر فرما کر دین اسلام کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔لیکن اگر اہلِ علم کی کسی مجلس میں موجودہ دور کی تفاسیر کا ذکر ہوگا تو اس میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی مشہور ومعروف اور مقبول ترین تفسیر ''تفہیم القرآن'' کا نام نمایاں طور پر سامنے آئے گا۔سید مودودیؒ نے اس تفسیر کو مکمل کرنے میں پورے تیس سال کی عرق ریزی اور محنت شاقہ سے کام لیا ہے۔یہ عظیم تفسیر ۱۹۴۲ء سے ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' میں قسط وار چھپنا شروع ہوئی اور ۷/جون ۱۹۷۲ء کو ظہر کی نماز سے پہلے صاحبِ تفسیر نے اس کے آخری فقرے تحریر فرمائے۔چار ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل اس تفسیر کو انہوں نے چھ ضخیم جلدوں میں منقسم فرمایا ہے۔ہر سورۃ کے شروع میں مولانا نے اس کے بارے میں ضروری بنیادی باتیں بھی درج کردی ہیں جو متعلقہ سورۃ کے تعارف کے لیے نہایت اہم اور معاون ہیں۔ان باتوں میں عام طور سے سورۃ کا نام' اس کی وجہ تسمیہ' اجزائے مضمون 'خطاب اور مباحث' زمانہ نزول اور شانِ نزول شامل ہیں۔ہر جلد کے آخر میں فہرست موضوعات کے عنوان سے اور حروفِ ابجد کی ترتیب سے موضوعات کا مختصر خاکہ بھی درج ہے۔

مولانا مودودیؒ کی یہ تفسیر حقیقت میں قرآنی علوم ومباحث کا بحرالعلوم یا دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) ہے۔اس میں جن مختلف مباحث وموضوعات پر سیر حاصل بحث ملتی ہے ان میں سے اکثر موضوعات ایسے ہیں کہ اگر ان کا مفصّل تذکرہ کیا جائے تو ہر موضوع کے لیے ایک بسیط کتاب لکھنے کی ضرورت ہوگی۔مثال کے طور پر اگر اس تفسیر کے ادبی محاسن کا ذکر کیا جائے تو یہ پہلو ایک کتاب کی ضخامت کا طالب ہوگا۔اسی طرح اس تفسیر میں جن عصری فتنوں کی نشان دہی اور ان کا حل پیش کیا گیا ہے' ان کا تذکرہ بھی کم از کم ایک کتاب کا حامل ضرور ہوگا۔یہی صورتحال تقابل ادیان کے موضوع پر دکھائی دیتی ہے۔بہرحال زیرنظر مضمون میں اس موضوع کو کم سے کم صفحات میں سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔

قرآن حکیم کی سب سے بڑی سورہ' سورۃ البقرۃ ہے۔اس میں جہاں متعدد مباحث ومضامین پر ارشاداتِ خداوندی موجود ہیں' وہیں تقابل ادیان پر بہت سی باتیں سامنے آتی ہیں۔مثلاً بنی اسرائیل کا ذکر حسبِ ذیل

☆ ریسرچ اسکالر شعبہ دینیات (سنی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی' علی گڑھ (انڈیا)

الفاظ سے شروع ہوتا ہے:

﴿یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِکُمۡ ۚ وَاِیَّایَ فَارۡهَبُوۡنِ﴿۴۰﴾﴾

''اے بنی اسرائیل! ذرا خیال کرو میری اس نعمت کا جو میں نے تم پر کی تھی۔ اور میرے ساتھ تمہارا جو عہد ہے اسے تم پورا کرو پس میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا' اور مجھ ہی سے ڈرو۔''

مولانا نے اس آیت اور اس سے متعلق تفصیلات کے ضمن میں جو بحث کی ہے' وہ اس پوری تقریر کو سمجھنے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ مولانا کا اقتباس اگرچہ طویل ہے مگر تقابل ادیان کے ایک طالب علم کے لیے اس کی افادیت مسلّم ہے۔ فرماتے ہیں:

''اسرائیل کے معنی ہیں عبداللہ یا بندۂ خدا۔ یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب تھا جو اُن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا تھا۔ وہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے تھے۔ انہی کی نسل کو بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ پچھلے چار رکوعوں میں تمہیدی تقریر تھی جس کا خطاب تمام انسانوں کی طرف عام تھا۔ اب یہاں سے چودھویں رکوع تک مسلسل ایک تقریر اس قوم کو خطاب کرتے ہوئے چلتی ہے' جس میں کہیں کہیں عیسائیوں اور مشرکین عرب کی طرف بھی کلام کا رُخ پھر گیا ہے' اور موقع موقع سے ان لوگوں کو بھی خطاب کیا گیا ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر ایمان لائے تھے۔ اس تقریر کو پڑھتے ہوئے حسب ذیل باتوں کو خاص طور پر پیش نظر رکھنا چاہیے:

اوّلاً: اس کا منشا یہ ہے کہ پچھلے پیغمبروں کی امت میں جو تھوڑے بہت لوگ ابھی ایسے باقی ہیں جن میں خیر و صلاح کا عنصر موجود ہے' انہیں اس صداقت پر ایمان لانے اور اس کام میں شریک ہونے کی دعوت دی جائے' جس کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اٹھائے گئے تھے' اس لیے ان کو بتایا جا رہا ہے کہ یہ قرآن اور یہ نبی وہی پیغام اور وہی کام لے کر آیا ہے جو اس سے پہلے تمہارے انبیاء اور تمہارے پاس آنے والے صحیفے لائے تھے۔ پہلے یہ چیز تم کو دی گئی تھی تاکہ تم آپ بھی اس پر چلو اور دنیا کو بھی اس کی طرف بلانے اور اس پر چلانے کی کوشش کرو۔ مگر تم دنیا کی رہنمائی تو کیا کرتے' خود بھی اس ہدایت پر قائم نہ رہے اور بگڑتے چلے گئے۔ تمہاری تاریخ اور تمہاری قوم کی موجودہ اخلاقی و دینی حالت خود تمہارے بگاڑ پر گواہ ہے۔ اب اللہ نے وہی چیز دے کر اپنے ایک بندے کو بھیجا ہے اور وہی خدمت اس کے سپرد کی ہے۔ یہ کوئی بیگانہ اور اجنبی چیز نہیں ہے' تمہاری اپنی چیز ہے۔ لہٰذا جانتے بوجھتے حق کی مخالفت نہ کرو' بلکہ اسے قبول کرلو۔ جو کام تمہارے کرنے کا تھا' مگر تم نے نہ کیا' اسے کرنے کے لیے جو دوسرے لوگ اٹھے ہیں' ان کا ساتھ دو۔

ثانیاً: اس کا منشا عام یہودیوں پر حجت تمام کرنا اور صاف صاف ان کی دینی و اخلاقی حالت کو کھول کر رکھ دینا ہے۔ ان پر ثابت کیا جا رہا ہے کہ یہ وہی دین ہے' جو تمہارے انبیاء لے کر آئے تھے۔ اصولِ دین میں سے کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے' جس میں قرآن کی تعلیم تورات کی تعلیم سے مختلف ہو۔ ان پر ثابت کیا جا رہا ہے کہ جو ہدایت تمہیں دی گئی تھی اس کی پیروی کرنے میں' اور جو رہنمائی کا منصب تمہیں دیا گیا تھا اس کا حق ادا کرنے میں تم بری طرح ناکام ہوئے ہو۔ اس کے ثبوت میں ایسے واقعات سے

استشہاد کیا گیا ہے جن کی تردید وہ نہ کر سکتے تھے۔ پھر جس طرح حق کو حق جاننے کے باوجود وہ اس کی مخالفت میں سازشوں' وسوسہ اندازیوں' کج بحثیوں اور مکاریوں سے کام لے رہے تھے' اور جن ترکیبوں سے وہ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح محمد ﷺ کا مشن کامیاب نہ ہونے پائے' ان سب کی پردہ دری کی جارہی ہے' جس سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ ان کی ظاہری مذہبیت محض ایک ڈھونگ ہے' جس کے نیچے دیانت اور حق پرستی کے بجائے ہٹ دھرمی' جاہلانہ عصبیت اور نفس پرستی کام کر رہی ہے اور حقیقت میں وہ یہ چاہتے ہی نہیں تھے کہ نیکی کا کوئی کام پھل پھول سکے۔ اس طرح اتمامِ حجت کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ ایک طرف خود اس قوم میں جو صالح عنصر تھا' اس کی آنکھیں کھل گئیں' دوسری طرف مدینے کے عوام پر اور بالعموم مشرکین عرب پر ان لوگوں کا جو مذہبی و اخلاقی اثر تھا' وہ ختم ہوگیا' اور تیسری طرف خود اپنے آپ کو بے نقاب دیکھ کر ان کی ہمتیں اتنی پست ہوگئیں کہ وہ اس جرأت کے ساتھ کبھی مقابلے میں کھڑے نہ ہوسکے جس کے ساتھ ایک وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے اپنے حق پر ہونے کا یقین ہو۔

ثالثاً: پچھلے چار رکوعوں میں نوعِ انسانی کو دعوتِ عام دیتے ہوئے جو کچھ کہا گیا تھا' اسی کے سلسلے میں ایک خاص قوم کی معین مثال لے کر بتایا جارہا ہے کہ جو قوم خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت سے منہ موڑتی ہے' اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس توضیح کے لیے تمام قوموں میں سے بنی اسرائیل کو منتخب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں صرف یہی ایک قوم ہے جو مسلسل چار ہزار برس سے تمام اقوامِ عالم کے سامنے ایک زندہ نمونہ عبرت بنی ہوئی ہے۔ ہدایتِ الٰہی پر چلنے اور نہ چلنے سے جتنے نشیب و فراز کسی قوم کی زندگی میں رونما ہوسکتے ہیں وہ سب اس قوم کی عبرتناک سرگزشت میں نظر آجاتے ہیں۔

رابعاً: اس سے پیروانِ محمد ﷺ کو سبق دینا مقصود ہے کہ وہ اس انحطاط کے گڑھے میں گرنے سے بچیں جس میں پچھلے انبیاء کے پیرو گر گئے۔ یہودیوں کی اخلاقی کمزوریوں' مذہبی غلط فہمیوں اور اعتقادی و عملی گمراہیوں میں سے ایک ایک کی نشاندہی کر کے اس کے بالمقابل دینِ حق کے مقتضیات بیان کیے گئے ہیں تاکہ مسلمان اپنا راستہ صاف دیکھ سکیں اور غلط راہوں سے بچ کر چلیں۔'' (تفہیم القرآن' ج ۱' ص ۷۰' ۷۱)

مولانا مودودی کی مذکورہ بحث اس قدر مفصّل اور واضح ہے کہ اس پر مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اسی طرح اسلام کی مخالفت میں یہودیوں کے طرزِ عمل اور ان کی وسوسہ اندازیوں اور الزام تراشیوں کا سید مودودی مکمل نقشہ پیش کرتے ہیں' ان کی گاؤ سالہ پرستی' اور خدا کو ماننے کے سلسلہ میں ان کی شرائط کا تجزیہ کرتے ہیں' قتل انبیاء اور ان کے دوسرے جرائم کی تفصیلات سامنے لاتے ہیں اور خود بائبل کے حوالے دے کر ان کے کئی جرائم ثابت کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

''یہ ہے اس قوم کی داستانِ جرائم کا ایک نہایت شرمناک باب جس کی طرف قرآن کی اس آیت میں مختصراً اشارہ کیا گیا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جس قوم نے اپنے فساق و فجار کو سرداری و سربراہ کاری کے لیے اور اپنے صلحاء و ابرار کو جیل اور دار کے لیے پسند کیا ہو' اللہ تعالیٰ اس کو اپنی لعنت کے لیے پسند نہ کرتا تو آخر اور کیا کرتا۔'' (تفہیم القرآن' جلد ۱' ص ۸۲)

صاحبِ تفہیم اس امر کی بھی پوری وضاحت فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل قرآنی تعلیمات کا انکار کسی نادانی یا

غلط فہمی کی وجہ سے نہیں کر رہے تھے بلکہ ان کا یہ انکار دانستہ تھا۔ اصل میں وہ اپنی بداعمالیوں کے باعث راہِ راست سے اس قدر دور نکل گئے تھے کہ وہ نہ صرف طالب ہدایت نہیں رہے تھے بلکہ دشمن ہدایت بن گئے تھے۔ اس کی مثال قرآن نے سورۃ البقرۃ کی ۸۹ ویں آیت میں دی ہے جس کی تفسیر میں سید مودودی رقم طراز ہیں کہ:

''نبی ﷺ کی آمد سے پہلے یہودی بے چینی کے ساتھ اس نبی کے منتظر تھے جس کی بعثت کی پیشین گوئیاں ان کے انبیاء نے کی تھیں۔ دعائیں مانگا کرتے تھے کہ جلدی سے وہ آئے تو کفار کا غلبہ مٹے اور پھر ہمارے عروج کا دور شروع ہو۔ خود اہل مدینہ اس بات کے شاہد تھے کہ بعثتِ محمدیؐ سے پہلے یہی ان کے ہمسایہ یہودی آنے والے نبی کی امید پر جیا کرتے تھے اور ان کا آئے دن کا تکیۂ کلام یہی تھا کہ ''اچھا' اب تو جس جس کا جی چاہے ہم پر ظلم کر لے' جب وہ نبی آئے گا تو ہم ان سب ظالموں کو دیکھ لیں گے۔'' اہلِ مدینہ یہ باتیں سنے ہوئے تھے' اسی لیے جب انہیں نبی ﷺ کے حالات معلوم ہوئے تو انہوں نے آپس میں کہا کہ دیکھنا' کہیں یہ یہودی تم سے بازی نہ لے جائیں۔ چلو' پہلے ہم ہی اس نبی پر ایمان لے آئیں۔ مگر ان کے لیے یہ عجیب ماجرا تھا کہ وہی یہودی' جو آنے والے نبی کے انتظار میں گھڑیاں گن رہے تھے' اس کے آنے پر سب سے بڑھ کر اس کے مخالف بن گئے۔

اور یہ جو فرمایا کہ ''وہ اس کو پہچان بھی گئے'' تو اس کے متعدد ثبوت اُسی زمانے میں مل گئے تھے۔ سب سے زیادہ معتبر شہادت اُم المؤمنین حضرت صفیہ کی ہے' جو خود ایک بڑے یہودی عالم کی بیٹی اور ایک دوسرے عالم کی بھتیجی تھیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ جب نبی ﷺ مدینے تشریف لائے' تو میرے باپ اور چچا دونوں آپؐ سے ملنے گئے۔ بڑی دیر تک آپؐ سے گفتگو کی۔ پھر جب گھر واپس آئے' تو میں نے اپنے کانوں سے ان دونوں کو یہ گفتگو کرتے سنا:

چچا: کیا واقعی یہ وہی نبی ہے' جس کی خبریں ہماری کتابوں میں دی گئی ہیں؟

والد: خدا کی قسم' ہاں۔

چچا: کیا تم کو اس کا یقین ہے؟

والد: ہاں۔

چچا: پھر کیا ارادہ ہے؟

والد: جب تک جان میں جان ہے' اس کی مخالفت کروں گا اور اس کی بات چلنے نہ دوں گا۔''

(تفہیم القرآن' ج ۱' ص ۹۳۔۹۴)

اس سے پہلے ذکر آ چکا ہے کہ سورۃ البقرۃ کے پانچویں رکوع سے چودھویں رکوع تک عموماً بنی اسرائیل کا تذکرہ ہے' اس کے بعد پندرھویں رکوع سے سورۃ کے آخر تک دیگر مسائل کے علاوہ بنی اسرائیل کا ذکر بھی کافی حد تک موجود ہے۔ اس حصہ کی تمہید میں سید مودودیؒ نے اس پورے حصہ کا خلاصہ پیش کیا ہے جو یہودیت' عیسائیت اور اسلام کے تقابلی مطالعہ کا موقع دیتا ہے۔ تفصیل کے طالب تفہیم کی پہلی جلد کے صفحات ۱۰۸ تا ۱۱۰ ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ قرآن پاک میں متعدد مقامات پر یہودیوں کا ذکر آیا ہے۔ ان کی بے راہ روی' حق سے

انحراف اوران کی دیگر گمراہیوں کی نشاندہی کر کے انہیں قبول حق کی دعوت دی گئی ہے۔مولانا مودودیؒ نے ایسے تمام مقامات پر انتہائی محققانہ معلومات درج فرمائی ہیں۔ایک محدود مقالہ یا مضمون میں ان سب کا احاطہ ممکن نہیں ہے اس کے لیے براہ راست تفہیم القرآن کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ہم یہاں یہود کو چھوڑ کر بنی اسرائیل کی دوسری شاخ نصاریٰ کا کچھ ذکر کرنا چاہتے ہیں۔بنی اسرائیل کی ہدایت ورہنمائی کے لیے مختلف اوقات میں متعدد پیغمبر مبعوث ہوئے' اوران میں سے ہر ایک کی تعلیمات کو اس قوم نے ٹھکرا دیا۔جس کے نتیجہ میں بنی اسرائیل مختلف گروہوں میں بھی بٹے مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک بہر حال وہ شدید باہمی اختلاف کے باوجود ایک قوم کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دور آیا تو جن لوگوں نے ان کی مخالفت کی' وہ اپنے دین یہودیت پر گامزن رہنے کے دعوے دار رہے اور جن لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دیا' انہیں نصاریٰ' نصرانی یا عیسائی کی اصطلاحات میں یاد کیا جانے لگا۔اس کی مثال قرآن نے ان الفاظ میں دی:

﴿فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا ۢ بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٣٩﴾﴾ (آل عمران)

''فرشتوں نے آواز دی جبکہ وہ محراب میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا کہ اللہ تجھے یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے' وہ اللہ کی طرف سے ایک فرمان کی تصدیق کرنے والا بن کر آئے گا اور اس میں سرداری و بزرگی کی شان ہوگی' کمال درجہ کا ضابطہ ہوگا' نبوت سے سرفراز ہوگا اور صالحین میں سے ہوگا۔''

اس آیت میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کا نام آیا ہے۔مولانا اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ بائبل میں ان کا نام ''یوحنا بپتسمہ دینے والا'' (John The Baptist) لکھا ہے۔

لفظ کلمہ یا فرمان کے بارے میں سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''اللہ کے 'فرمان' سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔چونکہ ان کی پیدائش اللہ تعالیٰ کے ایک غیر معمولی فرمان سے خرق عادت کے طور پر ہوئی تھی' اس لیے ان کو قرآن مجید میں 'کَلِمَةٌ مِّنَ اللّٰه' کہا گیا ہے۔''

مندرجہ بالا آیت اوراس کے بعد چند سطور میں جو بحث ہے' اس سے متعلق مولانا فرماتے ہیں:

''اس تقریر کا اصل مقصد عیسائیوں پر ان کے اس عقیدے کی غلطی واضح کرنا ہے کہ وہ مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا اور الٰہ سمجھتے ہیں۔تمہید میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کا ذکر اس وجہ سے فرمایا گیا ہے کہ جس طرح مسیح علیہ السلام کی ولادت معجزانہ طریقہ سے ہوئی تھی اسی طرح ان سے چھ ہی مہینہ پہلے اُسی خاندان میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش بھی ایک دوسری طرح کے معجزے سے ہو چکی تھی۔اس سے اللہ تعالیٰ عیسائیوں کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ اگر یحییٰ کو ان کی اعجازی ولادت نے الٰہ نہیں بنایا تو مسیحؑ محض اپنی غیر معمولی پیدائش کے بل پر الٰہ کیسے ہو سکتے ہیں؟'' (تفہیم القرآن' جلد ا' ص ۲۵۰)

قرآن حکیم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا نبی اور رسول قرار دیا ہے' جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی نبوت کا دعویٰ کیا تو بنی اسرائیل کے ایک گروہ (یہودیوں) نے ان کی نبوت کا انکار کر دیا۔یہ لوگ اس سے پیشتر بھی بہت سے نبیوں کو جھٹلا چکے تھے اور اس طرح ان کا انکار ایک قسم کا معمول بن چکا تھا جبکہ

یہودیوں کے مقابلہ میں بنی اسرائیل کے دوسرے گروہ (عیسائیوں) نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت ورسالت کی تصدیق تو کردی مگران کی عقیدت واحترام میں اس قدر غلواور مبالغہ آرائی سے کام لیا کہ الوہیت مسیح کا عقیدہ گھڑ لیا' یعنی دونوں گروہوں نے افراط وتفریط کا مظاہرہ کیا۔ جولوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا اقرار کرتے تھے' انہیں اپنی نبوت کا قائل کرنے کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ کہا وہ سورۂ آل عمران' آیت ۴۹ تا ۵۱ میں بعینہٖ مذکور ہے۔

اس کی تفصیل وتشریح میں مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام وہی دین لے کر آئے تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیاء علیہم السلام نے پیش کیا تھا۔ موجودہ اناجیل میں بھی واضح طور پر اس کے حوالے ملتے ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن' ج ۱' ص ۲۵۴' ۲۵۵۔

پیغمبروں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات گرامی اپنی خصوصیت کے اعتبار سے ایسی ہے کہ انہیں مسلمانوں کی طرح یہودی وعیسائی بھی اپنا مورثِ اعلیٰ تصور کرتے تھے لیکن ایک طرف وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا مذہبی مورث اعلیٰ کہتے تھے اور دوسری طرف ہدایت ونجات کے لیے یہودیت ونصرانیت قبول کرنے پر زور دیتے تھے۔ زیرنظر مضمون میں یہودیت وعیسائیت کے تمام حوالے تفہیم القرآن کی پہلی جلد سے ماخوذ ہیں۔ اس بحث سے متعلق تفہیم کی دیگر پانچ جلدوں سے بھی استفادہ کیا جانا چاہیے۔ لیکن اس مختصر مضمون میں سب کا احاطہ انتہائی مشکل ہے اس لیے یہود ونصاریٰ کے ذکر کو مذکورہ چند اشارات پر چھوڑ کر دیگر ادیان کی ایک جھلک اور اس سلسلہ میں تفہیم القرآن کے اہم نکات پیش کیے جاتے ہیں۔

یہود ونصاریٰ کے علاوہ قرآن پاک نے جن قوموں کا تذکرہ کیا ہے ان میں صابئین' مجوس' اور مشرکین خاص طور پر شامل ہیں۔ قرآن مجید میں ان سب قوموں کا ذکر بایں الفاظ آیا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰی وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِیْنَ اَشْرَكُوْٓا ۗ اِنَّ اللّٰهَ یَفْصِلُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ﴿۱۷﴾﴾ (الحج)

''جولوگ ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے' اور ستارہ پرست' نصاریٰ ومجوس اور جن لوگوں نے شرک کیا' ان سب کے درمیان اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فیصلہ فرمادے گا۔ یقیناً ہر چیز اللہ کی نظر میں ہے۔''

درج بالا آیت کریمہ میں جن ادیان کا ذکر آیا ہے سید مودودیؒ اس کی توضیح ایک ایک عنوان کے تحت کرتے ہیں' چنانچہ ''اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا'' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یعنی ''مسلمان'' جنہوں نے اپنے اپنے زمانے میں خدا کے تمام انبیاء اور اس کی کتابوں کو مانا' اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پچھلے انبیاء کے ساتھ آپؐ پر بھی ایمان لانا قبول کیا۔ ان میں صادق الایمان بھی شامل تھے اور وہ بھی تھے جو ماننے والوں میں شامل تو ہو جاتے تھے مگر ''کنارے'' پر رہ کر بندگی کرتے تھے اور کفر و ایمان کے درمیان مذبذب تھے۔'' (تفہیم القرآن' جلد ۳' ص ۲۱۰)

اَلَّذِیْنَ هَادُوْا کے ضمن میں مولانا لکھتے ہیں:

''یہ نہیں فرمایا کہ ''یہودی ہیں'' بلکہ فرمایا کہ ''یہودی بن گئے'' کیونکہ ابتداءً تو وہ بھی مسلمان ہی تھے جس طرح ہر

نبی کی اُمت اصل میں مسلمان ہوتی ہے مگر بعد میں وہ صرف یہودی بن کر رہ گئے۔''(تفہیم القرآن جلد۱ ص ۳۵۷)

صابئی کے بارے میں مولانا کی یہ تحقیق لائق ملاحظہ ہے :

''صابئی کے نام سے قدیم زمانہ میں دو گروہ مشہور تھے۔ایک حضرت یحییٰ کے پیرو جو بالائی عراق (یعنی الجزیرہ) کے علاقہ میں اچھی خاصی تعداد میں پائے جاتے تھے اور حضرت یحییٰ کی پیروی میں اصطباغ کے طریقہ پر عمل کرتے تھے۔دوسرے ستارہ پرست لوگ' جو اپنے دین کو حضرت شیث اور حضرت ادریس علیہما السلام کی طرف منسوب کرتے تھے اور عناصر پر سیاروں اور سیاروں پر فرشتوں کی فرماں روائی کے قائل تھے۔ان کا مرکز حران تھا اور عراق کے مختلف حصوں میں ان کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔یہ دوسرا گروہ اپنے فلسفہ وسائنس اور فن طب کے کمالات کی وجہ سے زیادہ مشہور ہوا ہے۔لیکن اغلب یہ ہے کہ یہاں پہلا گروہ مراد ہے کیونکہ دوسرا گروہ غالباً نزولِ قرآن کے وقت اس نام سے موسوم نہ تھا۔''(تفہیم القرآن' جلد۳' ص۲۱۰)

نصاریٰ کی توضیح میں مولانا فرماتے ہیں:

''لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ ''نصاریٰ'' کا لفظ ''ناصرہ'' سے ماخوذ ہے جو مسیح علیہ السلام کا وطن تھا۔دراصل اس کا ماخذ ''نصرت'' ہے' اور اس کی بنا وہ قول ہے جو مسیح علیہ السلام کے سوال مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ (اللہ کی راہ میں کون لوگ میرے مددگار ہیں؟ کے جواب میں حواریوں نے کہا تھا کہ ﴿نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ﴾ (ہم اللہ کے کام میں مددگار ہیں)۔عیسائی مصنفین کو بالعموم محض ظاہری مشابہت دیکھ کر یہ غلط فہمی ہوئی کہ مسیحیت کی ابتدائی تاریخ میں ناصریہ (Nazarenes) کے نام سے جو ایک فرقہ پایا جاتا تھا اور جنہیں حقارت کے ساتھ ناصری اور ایبونی کہا جاتا تھا' انہی کے نام کو قرآن نے تمام عیسائیوں کے لیے استعمال کیا ہے۔لیکن یہاں قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ انہوں نے خود کہا تھا کہ ہم ''نصاریٰ'' ہیں' اور یہ ظاہر ہے کہ عیسائیوں نے اپنا نام کبھی ناصری نہیں رکھا۔'' (تفہیم القرآن جلد۱' ص۴۵۵)

مجوس کی تشریح کرتے ہوئے مولانا رقمطراز ہیں:

''یعنی ایران کے آتش پرست جو روشنی اور تاریکی کے دو خدا مانتے تھے اور اپنے آپ کو زردشت کا پیرو کہتے تھے۔ان کے مذہب واخلاق کو مزدک کی گمراہیوں نے بری طرح مسخ کر کے رکھ دیا تھا' حتیٰ کہ سگی بہن سے نکاح تک ان میں رواج پا گیا تھا۔'' (تفہیم القرآن جلد۳' ص۲۱۱)

الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا کے بارے میں فرماتے ہیں:

''یعنی عرب اور دوسرے ممالک کے مشرکین جو مذکورہ بالا گروہوں کی طرح کسی خاص نام سے موسوم نہ تھے۔قرآن مجید ان کو دوسرے گروہوں سے ممیز کرنے کے لیے مُشْرِکین اور اَلَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا کے اصطلاحی ناموں سے یاد کرتا ہے' اگرچہ اہلِ ایمان کے سوا باقی سب کے ہی عقائد واعمال میں شرک داخل ہو چکا تھا۔''(تفہیم القرآن' جلد۳' ص۲۱۱)

اس طرح تمام ادیان و مذاہب کا تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ سید مودودیؒ اسلام کی صداقت وحقانیت ثابت کرتے چلے جاتے ہیں۔ان کے نزدیک ابتدائے آفرینش سے اصل دین اسلام ہی تھا' دیگر مذاہب خدائی ہدایات کو نظر انداز کر دینے اور الٰہی تعلیمات کو مسخ کر دینے کا لازمی نتیجہ ہیں۔اپنے اس نقطہ نظر کو انہوں نے تفہیم

القرآن کے مقدمہ میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: مقدمہ تفہیم القرآن، ص ۱۷، ۱۸۔

قرآن پاک نے اہلِ ایمان کو پورے کے پورے اسلام میں داخل ہونے کا حکم دیا ہے، ارشاد ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ (البقرۃ:۲۰۸) ''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو پورے کے پورے اسلام میں آ جاؤ''۔ مذکورہ الفاظ کی تفسیر میں صاحبِ تفہیم لکھتے ہیں:

''کسی استثنا اور تحفظ کے بغیر اپنی پوری زندگی کو اسلام کے تحت لے آؤ۔ تمہارے خیالات، تمہارے نظریات، تمہارے علوم، تمہارے طور طریقے، تمہارے معاملات اور تمہاری سعی و عمل کے راستے سب کے سب بالکل تابع اسلام ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ تم اپنی زندگی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے بعض حصوں میں اسلام کی پیروی کرو اور بعض حصوں کو اس کی پیروی سے مستثنیٰ کر لو۔'' (تفہیم القرآن، جلد ۱، ص ۱۶۰)

اس دنیا میں کتنے ہی ادیان بنا لیے جائیں لیکن انسان کی نجات کے لیے صرف اسلام کی پیروی ضروری ہے۔ قرآن بصراحت کہتا ہے:

﴿وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ﴾ (آل عمران)

''اور جو اسلام کے سوا کوئی اور طریقہ زندگی اختیار کرے گا، اس کا وہ طریقہ قابلِ قبول نہ ہوگا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد ہوگا۔''

اسلام درحقیقت انسانوں پر اللہ کا عظیم احسان ہے، قرآن میں ہے:

﴿فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ یَّهْدِیَهٗ یَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ﴾ (الانعام:۱۲۵)

''جسے اللہ ہدایت بخشنا چاہتا ہے تو اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔''

اس آیت کی تفسیر میں مولانا لکھتے ہیں:

''سینہ کھول دینے سے مراد اسلام کی صداقت پر پوری طرح مطمئن کر دینا اور شکوک و شبہات اور تذبذب و تردد کو دور کر دینا ہے۔'' (تفہیم القرآن، جلد ۱، ص ۵۸۰)

حاصل بحث یہ کہ تفہیم القران میں تقابل ادیان کا موضوع خصوصی شان کا حامل ہے۔ اس ضمن میں مولانا مودودیؒ نے اسرائیلی خرافات سے آلودہ روایات سے دینی لٹریچر خصوصاً تفسیری ادب کو پاک کرنے کا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ اہلِ ذوق کو اسلام کی حقانیت اور دیگر ادیان و مذاہب کی بے بضاعتی معلوم کرنے کے لیے اس معرکۃ الآراء تفسیر کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ریاست اور مذہب: اصل بیانیہ

ڈاکٹر خضر یاسین ☆

ریاست انسانی معاشرت کی عمرانی ضرورت ہے' اس کی حیثیت ظرف کی ہے اور حکومت کی حیثیت مظروف کی ہے۔ ریاست بغیر حکومت کے ناممکن ہے اور حکومت بغیر ریاست کے محال ہے۔ حکومت یا ہیئتِ حاکمہ کی باگ ڈور جن افراد کے ہاتھ میں ہوتی ہے وہ اولوالامر یا حکمران کہلاتے ہیں۔ حاکم اور محکوم حکومت کے ناگزیر عناصر ہیں اور ریاست کے لازمی اعضاء ہیں۔ اولوالامر کی اطاعت واتباع واجب ہے' انحراف بغاوت ہے اور قابلِ سزا جرم ہے۔ ریاست وسیاست کی یہی منطق ہے' ہم ریاست اور حکومت کا اس کے سوا کوئی معنی و مفہوم نہیں جانتے' بلکہ اس کے سوا حکومت وریاست کا کوئی معنی ومطلب ہم سمجھ بھی نہیں سکتے۔

نبی ﷺ کی نبوت سے قبل حکومت وریاست موجود تھی' آپؐ کے حین حیات میں پائی جاتی تھی اور مابعد دور میں بھی ریاست وحکومت قائم رہی اور اب تک موجود ہے۔ انسان جب تک روئے زمین پر موجود ہے حکومت و ریاست کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نبی علیہ السلام اللہ کے رسول تھے اور اولوالامر بھی تھے۔ ''اولوالامر'' انسان ساختہ ایک حیثیت یا ایک منصب کا نام ہے اور ''نبی اللہ'' ظاہر ہے انسان ساختہ حیثیت یا منصب کا نام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے نبی ﷺ سے پہلے اور آپؐ کے بعد اولوالامر اسی طرح رہے جیسے آپؐ تھے مگر مابعد میں کوئی ''رسول اللہ'' تھا اور نہ ہوسکتا تھا۔ اولوالامر کی حیثیت سے رسول اللہ ﷺ پر ''حکم اللہ'' کی اطاعت واتباع جس طرح واجب تھی' مابعد کے اولوالامر پر ''حکم اللہ'' کی اتباع واطاعت اسی طرح واجب ہے۔ اولوالامر کی اطاعت واتباع کا مطالبہ اس کے دور اقتدار میں کیا جاسکتا ہے' رسول اللہ ﷺ کی اولوالامری اطاعت واتباع آپ علیہ السلام کے حین حیات میں واجب التعمیل تھی' البتہ ''حکم اللہ'' کی اتباع واطاعت تا قیامت اسی طرح واجب التعمیل رہے گی جس طرح نبی علیہ السلام پر رہی ہے۔ ''اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ'' پر یہ اطاعت واتباع آج بھی بالکل اسی طرح واجب التعمیل ہے جس طرح نبی ﷺ پر واجب التعمیل تھی اور رہی ہے۔

محترم غامدی صاحب کا ریاست کی بابت موقف ریاست اور حکومت کے غیر متعلقہ اور ناقص تجزیے پر مبنی ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ ''اولی الامر منکم'' پر حکم اللہ کی اطاعت واتباع اسی طرح واجب التعمیل ہے یا نہیں ہے جس طرح رسول اللہ ﷺ پر بحیثیت اولوالامر واجب التعمیل تھی؟ اولوالامر کی اطاعت واتباع طوعاً وکرہاً واجب التعمیل ہے۔ اصل مشکل ''اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ'' کی بابت ہے' ان پر حکم اللہ کی اطاعت واتباع بالکل اسی طرح واجب التعمیل ہے جس طرح خود نبی علیہ السلام پر بحیثیت اولوالامر واجب التعمیل تھی۔ غامدی صاحب ''اولی

☆ اقبال اکیڈمی لاہور' ای میل yasinkhazir@gmail.com

الامر منکم'' کو حکم اللہ کا ویسا مطاع و مطیع نہیں سمجھتے جیسا کہ خود نبی علیہ السلام حکم اللہ کے مطاع و مطیع تھے۔ اولوالامر اگر ''منکم'' نہ ہوں تو اور بات ہے ''اولی الامر منکم'' پر حکم اللہ کی اطاعت و اتباع کے وجوب کو نظر انداز کرنا حیران کن ہے۔ ریاست کا کوئی دین و مذہب ہو نہ ہو' اولوالامر کا دین و مذہب کے بغیر تصور ممکن نہیں ہے۔ ''اولی الامر منکم'' کی پہلی اور آخری شرط حکم اللہ کی اطاعت ہے۔ بلکہ یہ اس سے کچھ سوا ہے' یہ اطاعت و اتباع بالکل اسی طرح ہونی ضروری ہے جس طرح نبی علیہ السلام نے کی ہے۔

غامدی صاحب کا خیال ہے کہ نبی علیہ السلام پر ایمان لانے اور نہ لانے کی حیثیت ''اختلاف رائے'' (differences of opinions) کی ہے۔ یہاں یہ واضح رہنا چاہیے کہ کفر اور ایمان میں اختلاف نہیں تضاد ہے اور ایمان کسی معنی میں بھی رائے نہیں ہے اور رائے کسی معنی میں بھی ایمان نہیں ہے۔ ''اولی الامر منکم'' کا شعور حکم اللہ کی اطاعت و اتباع سے اس وقت عاری ہو جاتا ہے جب وہ حکم اللہ کی اطاعت و اتباع کو اپنے اوپر اسی طرح واجب التعمیل نہیں سمجھتا جس طرح اولوالامر کی حیثیت سے نبی علیہ السلام حکم اللہ کو واجب التعمیل سمجھتے تھے۔ ریاست یا حکومت کا کوئی تصور ایسا نہیں جس میں حکم اللہ کے واجب الاتباع ہونے کی نسبت کوئی رویہ موجود نہ ہو۔ ریاست و حکومت کے اسی رویے سے یہ طے پاتا ہے کہ وہ ''اولی الامر منکم'' کے ہاتھ میں ہے یا کفر و شرک کے زیر نگیں ہے۔ حکم اللہ کی تعمیل اور عدم تعمیل انفرادی کے بجائے ارادی عمل ہے۔ حکم اللہ کو ترک کرنا یا واجب التعمیل بنانا ریاست یا حکومت کا ارادی عمل ہے' یعنی الاولوالامر کا ارادی فیصلہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بحیثیت اولی الامر جو عمل واجب التعمیل ہے' بعینہٖ اولی الامر منکم پر واجب التعمیل ہے۔ یہ اولی الامر منکم کی رائے نہیں ہے' یہ مسلم معاشرت کا انتظامی قضیہ ہے کہ حکم اللہ پر اسی طرح عمل کیا جائے جس طرح نبی علیہ السلام نے کیا ہے۔ حالات کو حکم اللہ کے مطابق بنانا اور حکم اللہ پر اسی طرح سے عمل کرنا جس طرح نبی علیہ السلام نے کیا ہے ''اولی الامر منکم'' کی ذمہ داری ہے اور اسی ذمہ داری کی بنیاد پر وہ مسلم معاشرت میں اطاعت و اتباع کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

''اجماع و اجتہاد'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی توسیع نہیں ہیں' منزل من اللہ دین نہیں ہیں' یہ مسلم معاشرت کی عمرانی ضرورت ہیں اور دینی ذمہ داری ہے۔ اجماع و اجتہاد اُس وقت بھی نبی علیہ السلام کی نبوت کی توسیع نہیں تھے اور منزل من اللہ دین تھے اور نہ سمجھے جاتے تھے' جب نبی علیہ السلام خود اولوالامر تھے۔ اجماع و اجتہاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا تسلسل کبھی تھے اور نہ اب ہیں۔ اجماع و اجتہاد اولوالامر کی انتظامی احتیاج ہیں' نبوت کا کوئی درجہ نہیں ہیں۔ اولو الامر ہونا اور نبی ہونا ایک شے نہیں ہے۔ اولو الامر کی اتباع کے جواز کا استناد وہ نہیں جو نبیؐ کی اطاعت کے واجب التعمیل ہونے کا ہے۔ مشاورت فی الامر حکم اللہ ہے' مشاورت سے تشکیل پانے والا حکم ''حکم اللہ'' نہیں ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ حکم دراصل مشاورت فی امر اللہ نہیں ہے بلکہ مشاورت فی الامر اور اولو الامر میں ''الامر'' ایک شے ہے۔ وحی شدہ حکم میں مشاورت کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ غامدی صاحب کا خیال ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اولو الامر ہونا آپؐ کی نبوت کی توسیع تھا' غلط ہے' وہ نبوت کی توسیع نہیں تھا۔ آپؐ اسی طرح اولوالامر تھے' جس طرح اولو الامر ہوتے ہیں۔ اولوالامر کی حیثیت سے آپ علیہ السلام پر حکم اللہ کی اتباع واجب تھی اس لیے مابعد کے ''اولی الامر منکم'' پر بھی وہ اتباع بعینہٖ واجب ہے اور رہے گی۔ غامدی صاحب کا یہ خیال کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی

حاکمیت آپ علیہ السلام کی نبوت کا حصہ تھی اور انسانی عمل کے بجائے الوہی فیصلہ تھا' انتہائی ناقص ہے اور گمراہ کن ہے۔ آپ علیہ السلام جس طرح انسان' بشر اور رسول تھے اور بشریت یا انسانیت آپ علیہ السلام کی نبوت کی توسیع نہیں تھی اسی طرح آپ کا اولی الامر ہونا بھی خالصتاً انسانی اور بشری حقیقت ہے اور نبوت و رسالت کی توسیع نہیں ہے۔ غامدی صاحب کے اس خیال کی غرض ''اولی الامر منکم'' کو حکم اللہ کی ویسی اطاعت و اتباع سے آزاد کرنے اور رکھنے کے سوا کچھ نہیں معلوم ہوتی' جیسی نبی علیہ السلام پر لازم و واجب تھی۔

اولوالامر ''حکم اللہ'' کی اطاعت و اتباع سے اپنے آپ کو خارج سمجھیں اور فارغ کر لیں تو وہ ''اولی الامر منکم'' نہیں ہیں' وہ فقط اولی الامر ہیں۔ حکم اللہ کی اتباع و اطاعت غیر مانوس اور غیر معمولی شے نہیں ہے' سامنے کی چیز ہے۔ حکم اللہ کی وہ اطاعت و اتباع جو نبی ﷺ نے فرمائی ہے' اس کا تعلق ہیئت حاکمہ کی تشکیل کے مناہج سے نہیں ہے' وہ اولوالامر کے رویے اور طرز عمل سے عیاں ہوتی ہے۔ غامدی صاحب اور دوسرے اصحاب کے مابین بحث کا رخ ہیئت حاکمہ کی تشکیل کے مناہج کا درست ہونا اور نہ ہونا ہے۔ یہ تنازع اور اس پر کی جانے والی بحث بالکل غیر متعلق اور اصل موضوع سے ہٹی ہوئی ہے۔ ہیئت حاکمہ کی تشکیل کا منہاج جمہوریت ہو یا آمریت' خلافت ہو یا بادشاہت غیر متعلق بحث ہے' اصل مسئلہ یہ ہے کہ اولوالامر پر ''حکم اللہ'' کی اطاعت و اتباع اسی طرح واجب التعمیل ہے کہ نہیں ہے جس طرح وہ خود رسول اللہ ﷺ پر تھی؟ مسلم معاشرت میں اولوالامر کا مطالبہ اطاعت حق بجانب ہے اگر وہ حکم اللہ کی اطاعت اسی طرح سے کرتے ہیں جس طرح سے خود نبی ﷺ نے فرمائی ہے۔ ایسے حکمرانوں کے خلاف خروج اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے خلاف خروج ہے۔ وہ اللہ اور اللہ کے رسول کے باغی ہیں' ان کا قتل واجب ہے' اس لیے کہ وہ فساد فی الارض کے مرتکب ہوتے ہیں۔ مسلم معاشرت کے اولوالامر حکم اللہ کی اطاعت و اتباع کو اپنے اوپر اس طرح واجب التعمیل نہ رہنے دیں یا نہ سمجھیں جیسی وہ خود نبی ﷺ پر تھی تو ان کے خلاف خروج کسی معنی میں بھی اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے خلاف بغاوت نہیں سمجھی جا سکتی۔

یہ امر طے ہے کہ ''حکم اللہ'' کا تعین اجماع سے ہوتا ہے اور نہ اجتہاد سے کیا جاتا ہے۔ اجماع و اجتہاد سے جن احکام کا تعین کیا گیا ہے وہ منزل من اللہ نہیں ہیں۔ حکم اللہ کا مبدأ فقط وحی خداوندی ہے' وہ کتاب و سنت ہے۔ اجماع و اجتہاد سے تشکیل پانے والے احکام انتظامی نوعیت کے احکام ہوتے ہیں جو احوال و ظروف میں بدل جاتے ہیں اور بدلے جا سکتے ہیں۔ غیر منزل من اللہ احکام کو منزل من اللہ احکام نہیں بنایا جا سکتا اور نہ انہیں منزل من اللہ سمجھا جا سکتا ہے۔ مسلم معاشرت پر ان کی اتباع کو واجب کرنا شرک فی النبوۃ ہے' اسی طرح حکم اللہ کی ویسی اطاعت و اتباع جیسی نبی علیہ السلام پر واجب تھی' اولوالامر کو اس سے بچانے کی ہر کوشش شرک فی النبوۃ کی ہی ایک صورت ہے۔ غامدی صاحب کے مخالفین کا یہ خیال غلط ہے کہ اجماع و اجتہاد نبی علیہ السلام کی نبوت کی توسیع ہیں جس طرح غامدی صاحب کا یہ خیال لایعنی ہے کہ نبی علیہ السلام کا اولوالامر ہونا آپ علیہ السلام کی نبوت کی توسیع ہے۔ حنفیت یا شافعیت وغیرہ نبی علیہ السلام کی نبوت کی ترقی یافتہ صورتیں نہیں ہیں کہ ان کے نفاذ کی جدّوجہد ''حکم اللہ'' کے نفاذ کی جدوجہد سمجھی جائے اور ان کی مخالفت ''حکم اللہ'' کی مخالفت متصوّر ہو۔

❁❁❁

دینی مدارس میں اصلاحات: تجاویز اور مشورے

محترمہ رضیہ مدنی

انگریز کے دور حکومت میں برصغیر پاک و ہند کا تعلیمی نظام مسجد و مکتب کے دو ستونوں پر قائم تھا۔ ہر مسجد کے ساتھ لازماً ایک مکتب ہوتا تھا جس میں مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام ہوتا تھا۔ مکتب کے علاوہ لنگر خانہ اور مسافر خانے کا بھی انتظام ہوتا تھا۔ مسجد، مکتب، لنگر اور مسافر خانے کے انتظام و انصرام کے لیے درکار مالی وسائل کی ضرورت اس وقف شدہ جاگیر سے پوری ہوتی تھی جو مسلمان بادشاہوں کی طرف سے مسجد کے لیے عطیہ کی جاتی تھی۔ ان حالات میں ائمہ مساجد اور علمائے مکتب معاشی طور خود کفیل تھے اور معاشرے میں ایک باوقار زندگی گزار رہے تھے۔

مکتب میں طلبہ دینی علوم کے علاوہ دنیاوی علوم میں منطق، فلسفہ، ریاضی، طب اور فلکیات وغیرہ کی تعلیم لازمی طور پر حاصل کرتے تھے۔ اس طرح دین اور دنیا دونوں کی تعلیم ایک ہی ادارے کی چھت کے نیچے دی جارہی تھی۔ ان مکاتب میں فارسی زبان ذریعہ تعلیم تھی جبکہ عربی زبان میں بھی تدریس ہوتی تھی، اور انہی مکاتب کے فارغ التحصیل طلبہ کو سرکاری مناصب حاصل ہوتے تھے۔

انگریز نے جب برصغیر پاک و ہند پر قبضہ کیا تو یہاں کے تعلیمی نظام کا جائزہ لینے کے بعد ایک نیا تعلیمی نظام پیش کیا جو دراصل دین و دنیا کی تفریق کا نظام تھا۔ ۱۸۳۴ء میں لارڈ میکالے نے برصغیر کے تعلیمی نظام کے حوالے سے جو تجویز پیش کی، اس میں دو باتیں اہم تھیں:

(۱) مساجد سے ان کی جاگیریں واپس لے لی گئیں، جس کی وجہ سے معاشرے میں مسجد اور مکتب کی نہ صرف مرکزی حیثیت ختم ہوگئی بلکہ ضروری مالی وسائل کی عدم موجودگی کے سبب سے ان کے لیے بقاء کا مسئلہ پیدا ہوگیا۔

(۲) انگریزی کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا اور یہ طے کر دیا گیا کہ انگریزی زبان جاننے والے ہی کورٹ، کچہری، فوج اور دیگر سرکاری اداروں میں ملازمت حاصل کرسکیں گے۔

ان دو فیصلوں کے نتیجے میں مکتب کا نظام درہم برہم ہوکر رہ گیا۔ اسی دور میں دہلی اور دیوبند وغیرہ میں دینی مدارس کی بنیاد رکھی گئی، جن کی مالی ضروریات عوام کی طرف سے حاصل ہونے والی زکوۃ، صدقات اور عطیات وغیرہ سے پوری کی جاتی تھیں۔ ان مدارس میں دینی علوم کی تعلیم کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور انگریزی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے فارغ التحصیل علماء کا کردار مسجد کی امامت کی حد تک محدود ہوکر رہ گیا، الا ماشاء اللہ۔ دوسری طرف سرسید احمد خان نے دُنیوی اور انگریزی تعلیم کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی اور

اس طرح آج مدرسہ وسکول اور دارالعلوم و یونیورسٹی کی تفریق کا نظام برصغیر پاک و ہند میں دو متوازی تعلیمی نظاموں کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے' جس میں دارالعلوم کے فارغ التحصیل اور یونیورسٹی گریجویٹ کے معاشرتی مقام' معاشی ضرورتوں کی تکمیل' معاشرے کی باگ ڈور سنبھالنے اور دنیاوی نظام کو چلا سکنے کی صلاحیت رکھنے میں واضح فرق موجود ہے۔

اس وقت ہمارے پیش نظر دینی مدارس کا نصابِ تعلیم' تعلیمی نظام اور مقاصدِ تعلیم ہیں کہ جسے وقت کی ضرورتوں اور تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے نظر ثانی کی اشد ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل تجاویز پیش خدمت ہیں:

(۱) مدارس کے تعلیمی نظام اور پیداوار کے معاشرے میں غیر مؤثر ہونے کا ایک سبب فرقہ واریت کے منہج سے دینی اسباق کی تدریس ہے۔ دینی مدارس خالص کتاب وسنت کی تعلیم کی بجائے اپنے اپنے مسالک اور فرقوں کی تعلیم کے ادارے بن گئے ہیں۔ اور یہ دراصل انگریز کی سازش کا نتیجہ ہے کہ جنہوں نے برصغیر پاک و ہند میں ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کے اصول پر حکومت کی ہے۔ مسلمانوں کو تقسیم کرنے کے لیے انہوں نے جو راستے اختیار کیے' ان میں کامیاب ترین مسلکی مناظروں اور فرقہ وارانہ اختلافات کی تبلیغ کا راستہ تھا' جس کے نتیجے میں وہ بغض پیدا ہوا کہ مخالف فرقے کے نمازیوں کا حالتِ نماز میں قتل بھی عین جہاد قرار پایا۔

(۲) دینی اور دنیاوی نظام تعلیم میں جو دوریاں پیدا ہوگئی ہیں' انہیں کم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ دینی مدارس کے منتظمین کو چاہیے کہ وہ بچوں کے لیے ایسی دنیاوی یا فنی تعلیم کا بھی بندوبست کریں کہ جسے وہ سند فراغت کے بعد معاشرے سے اپنی مالی ضروریات پوری کرنے کے لیے ایک وسیلہ کے طور استعمال کر سکیں۔ اسی طرح کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم میں بھی متعلقہ ڈگری کے بارے میں دینی معلومات اور خاص طور قرآن مجید کے ترجمہ کی تعلیم کا ایک مختص حصہ ہونا چاہیے تاکہ طلبہ گریجویٹ ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے انسان بھی ہوں کہ یہی دینی علوم کا مقصود ہے۔

اکثر دینی مدارس میں ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے' جیسا کہ ناظرہ' حفظ یا تجوید وغیرہ' جبکہ بعض میں درس نظامی کی تعلیم بھی ہے' لیکن تخصّص (specialization) کی تعلیم بہت کم مدارس میں ہے' جبکہ ہم اس وقت ایک ایسے دور میں رہ رہے ہیں جو تخصّص کا دور ہے۔ مدارس کو اس طرف خاص توجّہ دینی چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں متخصّص طلبہ پیدا کریں۔ اور مدارس اگر تخصّص ایسے موضوعات میں کروائیں جو دین اور دنیا کے امتزاج کو شامل ہوں تو معاشرے کو ایسے دینی رہنما حاصل ہو سکیں گے جو ایک طرف تو دینی علوم میں رسوخ رکھتے ہوں گے اور دوسری طرف معاشرے کی قیادت اور سیادت کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں گے۔

مدارس میں تعلیم کو جس قدر مرکزی توجہ حاصل ہے' اس نسبت سے تربیت کو بالکل بھی فوکس نہیں کیا گیا ہے۔ دینی تعلیم کا مقصد محض دینی معلومات کو ایک ڈکشنری کی صورت میں حافظے میں محفوظ کر لینا نہیں ہے' بلکہ

شخصیت کی تبدیلی اصل مطلوب ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی جو ذمہ داریاں قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں‘ ان میں تعلیم کتاب وحکمت کے علاوہ تلاوتِ آیات اور تزکیہ نفس بھی ہے۔ دینی مدارس کے منتظمین کو چاہیے کہ وہ طلبہ میں ذوقِ عبادت کی بیداری‘ تہجد واذکار کے اہتمام‘ اخلاقِ حسنہ سے تزئین اور رذائل سے اجتناب کے سلسلے میں بھی تربیت کے وسائل اور ذرائع مہیا کریں۔ طلبہ کی تربیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نصاب تعلیم میں ’’تربیت وتزکیہ‘‘ کے نام سے ایک مادے کا اضافہ کر دیا جائے کہ جس سے طلبہ کی اس موضوع کے بارے میں معلومات میں اضافہ ہو جائے‘ بلکہ تربیت ایک علمی مشق کا نام ہے کہ جس کے مربی اساتذہ درکار ہیں۔

مدارس میں غیر نصابی سرگرمیوں کی شدید ضرورت ہے‘ جس سے بچوں کی دیگر صلاحیتوں مثلاً تقریر اور تحریر وغیرہ کو اجاگر ہونے کا موقع ملے۔ اسی طرح مطالعاتی دورے بھی تعلیمی نظام کا حصہ ہونے چاہئیں۔ ہسپتال‘ قبرستان‘ آثار قدیمہ وغیرہ کے مطالعاتی دورے نہ صرف عبرت کا سامان فراہم کرنے کا سبب بن جائیں گے بلکہ خالق کی نعمتوں پر دل سے شکر گزاری کے جذبات بھی پیدا کر دیں گے۔ اس سلسلے میں طلبہ میں حسن قراءت‘ تقریر اور تحریر وغیرہ کے انعامی مقابلے کروائے جا سکتے ہیں۔ انہیں طہارت‘ یونیفارم کے صاف ستھرا ہونے‘ نشست وبرخاست کے سنت طریقوں کے اختیار کرنے پر ترغیبی انعام دیا جا سکتا ہے۔

مدارس میں جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ایسے وسائل اور ذرائع کو استعمال کرنے کی ضرورت ہے جو لغویات میں شامل نہ ہوں اور تعلیم کے وقار اور سنجیدگی کو ختم نہ کریں‘ مثلاً کلاس میں پروجیکٹر اور سلائیڈز وغیرہ کا استعمال۔ اس طرح نہ صرف تدریس کو دلچسپ بنایا جا سکتا ہے بلکہ اسباق کی آڈیو اور ویڈیو ریکارڈنگ کے ذریعے اس کے فائدے کو ہزاروں لوگوں تک عام کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ان اصلاحات کے لیے وسائل کا ہونا ضروری ہے لیکن وسائل کے حصول سے پہلے فکر اور سوچ کی تبدیلی اور اس کے مطابق عمل کرنے کے لیے جذبے کا ہونا ضروری ہے۔ ❁❁❁

بقیہ: اسلامی نظریہ حیات

لیکن ان کا خیر وشر ہونا شرعی ہے[۱۸۴]۔ خیر وہ ہے جسے خالق نے خیر قرار دیا ہو اور شر وہ ہے جسے خالق نے شر کہا ہو۔[۱۸۵]

خالق کے فرمانبردار سے محبت کرنا اور اس کے باغی سے نفرت رکھنا اس پر ایمان کا حق ہے[۱۸۶]۔ لہٰذا دعوت کے اخلاق اور جہاد کے اخلاق میں فرق ہے[۱۸۷]۔ نیکی ’’حسن اخلاق‘‘ پیدا کرتی ہے جبکہ بدی ’’بدترین اخلاق‘‘ کو جنم دیتی ہے۔[۱۸۸]

بعض اخلاق جبلی ہیں اور اکثر ایمان سے پیدا ہوتے ہیں[۱۸۹]۔ ایمان اور اخلاق کا تعلق لازم وملزوم کا ہے[۱۹۰]۔ حسن اخلاق‘ کمالِ ایمان کا نتیجہ ہے[۱۹۱]۔ حسنِ اخلاق کی تکمیل محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات میں ہوئی[۱۹۲]۔ لہٰذا بہترین اخلاق وہ ہیں جو اسوۂ حسنہ کی اتباع سے پیدا ہوتے ہیں۔[۱۹۳]

حواشی

اس مضمون کے حواشی (حوالہ جات اور وضاحتی نوٹ) اصل مضمون سے تقریباً تین گنا زیادہ صفحات پر محیط ہیں‘ جو یہاں شامل اشاعت نہیں کیے جا رہے۔ البتہ حواشی سمیت پورا مضمون ہماری ویب سائٹ www.tanzeem.org پر اَپ لوڈ کیا جا رہا ہے‘ جہاں پر مکمل مضمون ملاحظہ کیا جا سکتا ہے اور اس کی سافٹ کاپی بھی ڈاؤن لوڈ کی جا سکتی ہے۔ ❁❁❁

پانی کی مادّی اور رُوحانی قوتوں کا راز

ڈاکٹر ایم انعام کھوکھر ☆

نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ زمانہ کے مختلف ادوار میں اپنے پیغمبروں کے ذریعے ضروری احکامات نازل فرماتے رہے ہیں۔ کچھ پیغمبروں پر جو احکامات نازل ہوئے ان کو کتابی شکل دے دی گئی جن کو ہم الہامی کتابیں کہتے ہیں۔ اس سلسلے میں آخری الہامی کتاب قرآن کریم ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر محمد ﷺ پر نازل فرمائی جس میں انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارنے کے لیے ہر قسم کی ہدایت موجود ہے۔ علمائے اسلام نے حضور ﷺ کی سیرتِ مبارکہ اور احادیث (جس میں قرآنی احکامات کی عملی وضاحت موجود ہے) کی روشنی میں قرآنی آیات کی تفسیر اور فقہی اصول مرتب کیے۔ ان علماء کرام میں سے اکثر کی رائے میں قرآن بنیادی طور پر انسان کی دنیا میں کامیاب زندگی گزارنے کے لیے ہدایت کی کتاب ہے جس میں حقوق اللہ (یعنی عبادات) اور حقوق العباد کو ادا کرنے کے طریقے مختلف انداز میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ توحید، رسالت اور زندگی بعد از موت کو بھی تفصیل کے ساتھ سمجھا دیا گیا ہے۔ ان علوم کے علاوہ قرآن میں بہت سے مقامات پر سائنسی حقائق کا بھی تذکرہ ہے۔ یہاں جاننا ضروری ہے کہ مختلف ادوار میں قرآن فہمی کے تقاضے مختلف رہے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ عجمی ممالک (خصوصاً برعظیم پاک و ہند) میں قرآن کا ترجمہ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ قرآن کا سب سے پہلا ترجمہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فارسی زبان میں کیا۔ اس کے بعد شاہ صاحبؒ کے دو فرزندوں نے قرآن کا اردو میں لفظی ترجمہ اور سلیس ترجمہ کیا۔

پچھلے تقریباً پچاس سال میں سائنس اور ٹیکنالوجی میں اتنی زیادہ ترقی ہوئی ہے کہ قرآن فہمی اور دین فہمی کے جدید تقاضے پیدا ہو گئے ہیں۔ خاص طور پر مسلمان اور اسلامک سکالرز جو یورپ، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ میں آباد ہو گئے ہیں ان کی طرزِ فکر اور طرزِ تحقیق نے جدید جہتیں اختیار کر لی ہیں۔ اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب **حجة الله البالغه** کے دیباچہ میں چند سطور لکھی ہیں جو آج کے دور میں بھی بھرپور توجہ کی مستحق ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''میری دانست میں تمام علومِ حدیث میں سے زیادہ دقیق فن جس کی جڑ نہایت عمیق ہے اور اس کا مینار نہایت بلند ہے اور میری نظر میں جو تمام علومِ شرعیہ سے زیادہ بلند مرتبہ اور عالی قدر ہے وہ اسرارِ دین کا علم ہے، جس میں تمام احکام دین کی حکمت اور ایک ایک عمل کے راز اور نکات بیان کیے جاتے ہیں۔ باللہ وہ تمام علموں میں سب سے زیادہ اس کا مستحق ہے کہ جس سے بن پڑے اپنے نفیس وقتوں کو اس میں صرف کیا

☆ کولمبس اوہائیو، امریکہ، ای میل drinamus@gmail.com

کرے اور مفروضہ طاعتوں کے بعد معاد کے لیے اس کو ذخیرہ کرے' اس لیے کہ شریعت کے احکام میں اس کے ذریعہ سے بصیرت پیدا ہوتی ہے۔''

اس تمہید کے بعد اب میں اپنے اصل مضمون کو بیان کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ اشیاء میں پانی نہایت پُر اسرار مادی اور روحانی قوتوں کا منبع ہے۔ پانی میں ایسی انوکھی اور عجیب وغریب قوتیں ہیں جو دنیا کی کسی اور چیز میں نہیں پائی جاتیں۔ سائنسدانوں اور فلاسفہ کے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات سمجھ نہیں آئے گی کہ پانی کو یہ مقام کیسے حاصل ہوا' لیکن اہل اللہ اور اہل بصیرت سورۂ ہود کی مندرجہ ذیل آیت سے اس راز کو خوب سمجھ سکیں گے۔ سورۂ ہود کی یہ آیت توجہ کی مستحق ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (آیت ۷)

''اور وہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں' اور اس کا تخت تھا پانی پر' تاکہ تمہیں آزمائے کہ کون ہے تم میں سے اچھے عمل کرنے والا۔''

اس آیت کے مضمون میں جس چیز پر زور (thrust) دیا گیا ہے وہ کائنات کی تخلیق کا مقصد ہے جو یہ ہے کہ تمہیں آزمایا جائے کہ اس کائنات میں رہتے ہوئے تم میں سے کون ہیں جو نیک اعمال کریں گے۔ آیت کے ان دو حصوں کے درمیان یہ ٹکڑا ﴿وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ﴾ ڈال کر بتا دیا کہ کائنات کی تخلیق کے وقت پانی اللہ تعالیٰ کے تخت کے ساتھ لگا ہوا تھا جس سے پانی کو اللہ تعالیٰ نے ایسی روحانیت اور جسمانیت عطا کی کہ اس میں باذن اللہ زندگی کا آغاز کرنے کی طاقت پیدا ہو گئی اور اس زندگی کی بقا کے لیے اس میں وہ مادی' روحانی اور نفسیاتی طاقتیں پیدا ہو گئیں جو دنیا کی کسی اور مادی شے میں نہیں ملتیں۔ آیت کے تینوں ٹکڑوں کو اللہ تعالیٰ نے اسی ترتیب میں رکھا۔ اور کون جانے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی اور کتنی حکمتیں ہوں گی۔ (واللہ اعلم!)

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس آیت کی تفسیر اپنی انگلش کی تفسیر ماجدی میں یوں بیان کی ہے:

(before the creation of the heavens and the earth). This is only a restatement of the well-known scientific fact that a universal sea preceded the birth of the land. If the Bible: "And the earth was without form, and void; and darkness was upon the face to the deep. And the spirit of God moved upon the face of the waters."(Ge.1:2) According to another rendering, adopted by Ewald, Dillmann, and Schrader (following Rishi), "And the earth was waste and void, and darkness over the watery abyss, and the breath of God was brooding over the waters." (D.B.I, 502) It is , however, to be noted that unlike the Bible which lays down a sequence of the creation of the heavens and earth, and which has been disproved by modern scientific researchers, the Quran does not describe their origin in any particular sequence.

اور اپنی اردو تفسیر میں مولانا عبدالماجد دریابادی یوں لکھتے ہیں کہ:

''قرآن مجید نے اس حقیقت کو ایک دوسری جگہ یہ کہہ کر اور صاف کر دیا ہے کہ اس کائنات کی جاندار مخلوق کا مادۂ حیات پانی ہی ہے۔'' (الانبیاء:۳۰)

اللہ تعالیٰ اس آیت میں پانی کی مادی اور روحانی قوتوں کے راز کو یوں فاش کر رہے ہیں کہ جب اس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں تخلیق کیا تو اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا۔ اس آیت میں دو باتوں کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ پہلی بات یہ کہ پانی کی تخلیق آسمانوں اور زمین سے پہلے ہو چکی تھی۔ دوسری بات یہ کہ ان چھ دنوں میں پانی نے لگاتار اللہ تعالیٰ کے عرش کو اٹھائے رکھا۔ پانی میں اللہ تعالیٰ کے عرش کے ساتھ اس قربت کی وجہ سے وہ مادی اور روحانی قوتیں پیدا ہو گئیں جو دنیا کی کسی اور چیز میں نہیں۔ یہی بات ایک حدیث میں بھی بیان کی گئی ہے۔ اس حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال قبل مخلوقات کی تقدیر لکھی' اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا۔ (صحیح مسلم: کتاب القدر' صحیح بخاری: کتاب بدء الخلق)

سبحان اللہ! اس پانی کو اللہ تعالیٰ نے کیا شرف بخشا کہ اس کو آسمان و زمین سے پہلے پیدا کیا' اور کائنات کی تخلیق کرتے ہوئے چھ دن لگاتار اپنا عرش اس پر رکھا۔ احادیث مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے کی بہت فضیلتیں بیان ہوئی ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ پانی جس نے عرش کو چھ دن اٹھائے رکھا اس کی مادی اور روحانی فضیلت کا کیا مرتبہ ہو گا۔ اس کی فضیلت کا اندازہ آپ اس حقیقت سے بھی لگا سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر زندہ (جاندار) چیز کو پانی سے تخلیق کیا' جیسا کہ سورۃ الانبیاء کی آیت ۳۰ سے ظاہر ہوتا ہے۔

﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۳۰﴾

''اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا۔ کیا یہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے؟''

نہ صرف یہ کہ ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا بلکہ اس کی تمام مادی اور روحانی ضرورتوں کا انحصار بھی پانی پر رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے پانی اور زندگی کا ایسا باہمی رشتہ بنا دیا ہے کہ زندگی کا پانی کے بغیر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک ایسی مسلّمہ حقیقت ہے جس کو دنیا کے تمام سائنس دان تسلیم کر چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس دان اب دوسرے سیاروں پر زندگی کی موجودگی معلوم کرنے کے لیے وہاں زندہ اشیاء نہیں بلکہ پانی کی موجودگی تلاش کرتے ہیں' کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جہاں پانی ہو گا وہاں لازمی طور پر زندگی ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے پانی اور زندگی کو لازم و ملزوم بنا دیا ہے۔ پانی کی سب بڑی صفت یہ ہے کہ وہ اپنے اندر زندگی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور یہ صفت دنیا کی کسی اور چیز میں نہیں۔ سائنس دانوں نے زندگی کے آغاز کی بہت سی theories بنائیں' لیکن انہوں نے اس سمت میں کبھی نہیں سوچا کہ پانی کے اندر یہ inherent صفت (جو اللہ تعالیٰ نے پانی کی تخلیق کرتے ہوئے پانی کی ذات میں پیدا کر دی' جو کہ بظاہر تو پانی کی ذاتی لگتی ہے لیکن حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے) ہو سکتی ہے کہ وہ زندگی کو جنم دے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ مسلمان Biologists اس حقیقت کو سائنسی تجربات سے ثابت (confirm) کریں۔ زندگی میں جو مادی اور روحانی عناصر ہیں وہ درحقیقت پانی سے ہی حاصل کردہ ہیں۔ آیئے اب پانی کی کچھ مادی اور روحانی قوتوں کا جائزہ لیں۔

پانی کی مادی طاقتیں

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ پانی کی سب سے بڑی مادی طاقت یہ ہے کہ وہ اپنے اندر زندگی کا نہ صرف آغاز کر سکتی ہے بلکہ اس زندگی کو برقرار اور ارتقائی راستے پر گامزن کرنے میں تمام سہولتیں مہیا کر سکتی ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ زندگی برقرار رکھنے کے لیے سب سے پہلے آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے جو ہم انسان ہوا میں سانس لینے سے پوری کرتے ہیں' کیونکہ ہوا میں آکسیجن کافی مقدار میں (21٪) موجود ہے۔ پانی میں جس قسم کی زندگی پیدا ہو گی اس کی آکسیجن کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پانی کے اندر ہوا سے آکسیجن جذب کرنے کی قوت رکھ دی۔ پانی کے اندر یہ جذب شدہ آکسیجن دریائی یا سمندری جانوروں یعنی ہر قسم اور ہر سائز کی مچھلی کے لیے کافی مقدار میں موجود رہتی ہے۔

کیمیا دان (Chemists) پانی کو universal solvent یعنی آفاقی محلل کہتے ہیں (محلل اس مائع کو کہتے ہیں جو دوسری اشیا کو اپنے اندر حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو) پانی بے شمار چیزوں کو کسی نہ کسی حد تک اپنے اندر حل کرنے کی وہ طاقت رکھتا ہے جو کسی اور مائع میں نہیں ملتی۔ عملی لحاظ سے اس طاقت کے بے شمار فوائد ہیں جن میں سے نمایاں فوائد مندرجہ ذیل ہیں۔ ہر قسم کی مادی صفائی کے لیے پانی بہترین مائع ہے۔ کوئی اور مائع پانی کی اس صلاحیت میں اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ہم کیا اندازہ لگا سکتے ہیں جس نے پانی جیسی نعمت کو ہر جگہ اتنی وافر مقدار میں مہیا کر دیا ہے کہ ہم بآسانی جب چاہیں اور جتنا چاہیں حاصل کر سکتے ہیں۔ سمندر زمین کی تقریباً ۷۰ فی صد سطح کو ڈھانپے ہوئے ٹھاٹھیں مار رہے ہیں۔ اس کے علاوہ پہاڑوں پر برف اور چشموں کی صورت میں اور پھر بہتے ہوئے بڑے بڑے دریا اور نہریں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مظاہر ہیں۔ اور بادلوں سے جو بارش ہوتی ہے وہ نہ صرف ہمارے اردگرد کی ہوا کی آلودگی ختم کر کے اسے صاف ستھرا اور تر و تازہ بنا دیتی ہے بلکہ ہمارے اناج سبزیوں اور پھلوں کی پیداوار میں انتہائی مفید ہے۔ ہمارے بدن کی صفائی' ہمارے کپڑوں کی صفائی' ہمارے گھروں کی صفائی غرض یہ کہ ہماری ہر چیز کی صفائی کا دارومدار پانی پر ہی ہے۔

ہر قسم کی غذائی پیداوار یعنی اناج اور مختلف انواع کے پھلوں کی نشوونما بھی پانی ہی کی مرہونِ منت ہے۔ پھولوں کے دلوں کو لبھانے والے طرح طرح کے رنگ اور ان کی خوشبوؤں کا ہوا کو معطر کر دینا بھی پانی کے بغیر ناممکن ہے۔ شہد بنانے والی مکھیاں اور خوبصورت اڑتی ہوئی تتلیاں اور ننھے منے رنگ دار اڑتے اور چہچہاتے ہوئے پرندے سب پانی ہی کی بدولت ہیں اور بارش کے بعد کبھی کبھی قوسِ قزح کا آسمان پر ظاہر ہونا کیا خوبصورت سماں پیش کر کے اللہ تعالیٰ کی بڑائی کا مظاہرہ پیش کرتا ہے۔ غرض یہ کہ زندگی کی بقا اور زندگی کی رمق دمق پانی کی مادی قوتوں ہی کی وجہ سے ہے۔ ان قوتوں کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاعراف (آیت ۵۷) میں کیا خوبصورت انداز میں کھینچا ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰی لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۝۵۷﴾ (الاعراف)

''اور وہ (اللہ) ہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے خوشخبری لیے ہوئے بھیجتا ہے۔ پھر جب وہ پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھا لیتی ہیں تو انہیں کسی مردہ سرزمین کی طرف حرکت دیتا ہے اور وہاں مینہ برسا کر اسی مری ہوزمین سے طرح طرح کے پھل نکال لاتا ہے۔ دیکھو اس طرح ہم مردوں کو حالت موت سے نکالتے ہیں شاید کہ تم (اس مشاہدے سے) سبق لو۔''

دریائی اور سمندری جانوروں یعنی مچھلیوں وغیرہ کی زندگی کا انحصار پانی کی اپنے اندر آکسیجن کو ہوا سے جذب یا حل کرنے کی صلاحیت پر مبنی ہے۔ ہر جاندار چیز کی حیات کی بقا آکسیجن کو اپنے جسمانی سسٹم (system) میں داخل کرتے رہنے پر موقوف ہے۔ اگر پانی کے اندر یہ صلاحیت نہ ہوتی تو کوئی بھی مچھلی یا آبی جاندار پانی کے اندر زندہ نہ رہ سکتا۔

پانی اپنی تین جسمانی حالتوں (physical states) (یعنی گیس، مائع اور ٹھوس) میں آسانی سے تبدیل ہو جاتا ہے۔ پھر پانی واحد ایسا مائع ہے جو ٹھوس حالت میں تبدیل ہونے پر اپنے وزن میں مائع پانی سے ہلکا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے برف پانی کے اوپر تیرتی ہے۔ اس برف کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ سردی اور گرمی کو اپنے اندر سے گزرنے کے لیے بہت مؤثر رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ پانی کی اس صلاحیت کی وجہ سے شدید سردی کے موسم میں دریاؤں اور جھیلوں میں پانی کی اوپر کی کچھ تہہ (layer) برف میں تبدیل ہو کر نیچے کے پانی کو منجمد ہونے سے محفوظ کر دیتی ہے، جس سے اُن کے اندر آبی جاندار آسانی سے سردی کا موسم گزار لیتے ہیں۔ برف یا snow کی اسی صلاحیت کی بنا پر اسکیمو لوگ آسانی سے اپنے برف کے بنائے ہوئے مکانوں یا جھونپڑوں میں زندگی بسر کر لیتے ہیں۔

سورۃ النمل میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو سمجھانے کے لیے اپنی ذات کی پانچ بڑی نشانیاں بیان کر کے ان کو یوں مخاطب کیا ہے کہ بتاؤ اللہ کے علاوہ کون سی ہستی ہے جو ان جیسی نشانیوں کی مالک ہے؟ ان پانچ بڑی نشانیوں کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق اور پانی کی نشانی کا سب سے پہلے ذکر کیا ہے:

﴿اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ۝۶۰﴾ (النمل)

''بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لیے آسمان سے پانی برسایا؟ پھر اس کے ذریعہ سے وہ خوش نما باغ اُگائے جن کے درختوں کا اُگانا تمہارے بس میں نہ تھا۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی (ان کاموں میں) شریک ہے؟ (نہیں) بلکہ یہی لوگ راہِ راست سے ہٹ کر چلے جا رہے ہیں۔''

پانی کے جسمانی صحت کے لیے بے شمار فوائد ہیں۔ ایلوپیتھک دوائیوں کے side effects کو کم کرنے کے لیے ڈاکٹر پانی کے زیادہ استعمال کا مشورہ دیتے ہیں۔ گرمیوں میں dehydration کے مضر اثرات سے بچنے کے لیے بھی زیادہ پانی پینا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ زیادہ گرمی میں ٹھنڈے پانی سے نہانا انتہائی مفید اور فرحت بخش ہوتا ہے۔ پانی جب جسم کے اندر جاتا ہے تو ہر خلیے کی صفائی کر کے پیشاب کے راستے گندے پانی کی شکل میں خارج ہو جاتا ہے۔

پانی کی روحانی اور نفسیاتی طاقتیں

پانی کی روحانی قوتوں کو ہر مذہب میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ایک حدیث کے مطابق طہارت (جو کہ پانی سے کی جاتی ہے) نصف ایمان (یا ایمان کا حصہ) ہے۔اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں کہ وہ پاکیزگی رکھنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں میں انگلش کا یہ قول مقبول ہے Cleanliness is next to Godliness اسلام میں طہارت یعنی پاکیزگی کو بہت اہم قرار دیا گیا' چنانچہ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری (نماز) سے پہلے پانی سے وضو کرنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔اور بعض جسمانی حالت میں نہانا لازمی ہے۔زم زم چشمہ جو کہ ایک معجزہ کی شکل میں نمودار ہوا اس کا پانی انتہائی روحانی اور متبرک سمجھا جاتا ہے اور ہر مسلمان جو حج یا عمرہ کے لیے جاتا ہے وہ زم زم کا پانی چند گیلن ضرور لاتا ہے تا کہ اپنے عزیز و اقارب کو بطور خاص تحفہ پیش کر سکے۔ عیسائی لوگ بپتسمہ (baptism) کے پانی کو بہت متبرک سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس سے روح کی آلودگیاں دُھل جاتی ہیں اور روح پھر سے صاف ستھری ہو جاتی ہے۔ یہودی لوگ عبادت سے پہلے اپنے ہاتھوں کو ایک روحانی رسم سمجھ کر دھونا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہندو لوگ گنگا دریا کے پانی کو متبرک سمجھتے ہیں اور ان کے عقیدے کے مطابق اس دریا میں نہانے سے ان کے تمام پاپ یعنی گناہ دُھل جاتے ہیں۔

قرآن کریم کی سورۃ المائدۃ (آیت ٦) میں اللہ تعالیٰ نے ہر نماز سے پہلے وضو کرنے کی تلقین کی ہے اور اس کا طریقہ کار بھی بیان کر دیا ہے۔اس کا ترجمہ مولانا مودودی نے تفہیم القرآن میں یوں کیا ہے:

> ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم نماز کے لیے اٹھو تو چاہیے کہ اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھو لو' سروں پر ہاتھ پھیر لیا (یعنی سر کا مسح) کرو اور پاؤں ٹخنوں تک دھو لیا کرو۔اگر جنابت کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہو جاؤ۔اگر بیمار یا سفر کی حالت میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے یا تم نے عورتوں کو ہاتھ لگایا ہو اور پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو' پس اس پر ہاتھ مار کر اپنے منہ اور ہاتھوں پر پھیر لیا کرو۔اللہ تم پر زندگی تنگ نہیں کرنا چاہتا مگر وہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دے شاید کہ تم شکر گزار بنو۔''

ہماری روح پر اردگرد کے حالات کے بہت سے نفسیاتی اثرات بھی ہوتے ہیں جس سے, tension اور stress اور depression وغیرہ ہو جاتی ہیں اور روح بے چین ہو جاتی ہے۔ ماہر نفسیات اور اطباء کی رائے ہے کہ منہ ہاتھ دھونے سے یا نہانے سے ایسی نفسیاتی بیماریوں میں کافی افاقہ ہو جاتا ہے۔ان کا خیال ہے کہ پانی میں روحانی اور جذباتی احساسات کو درست (heal) کرنے کا کافی potential ہے۔چنانچہ گرمی کے موسم میں رم جھم بارش برسنے سے طبیعت میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ساحل سمندر پر سیر کرنے اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کا نظارہ کرنے سے بھی طبیعت میں کافی خوشگواری آ جاتی ہے۔

انسانی ساخت کی biology پر جو ریسرچ ہوئی ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ جیسے ہمارا جسم پانی کے اوپر تیر رہا ہے۔چنانچہ H.H.Mitchell نے Journal of Biological Chemistry158 میں اپنی ریسرچ کے نتائج کو بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ہمارے جسم کے مختلف اعضاء کی ساخت میں پانی کی مقدار کچھ یوں ہے:

دماغ اور دل میں پانی	۷۳٪
پھیپھڑوں میں پانی	۸۳٪
جلد میں پانی	۶۴٪
گوشت کے پٹھے اور گردوں میں پانی	۷۹٪
ہڈیوں میں پانی	۳۱٪

ان نتائج سے پتا چلتا ہے کہ ہمارے تمام اعضاء کو صاف ستھرا پانی مہیا کرنا کتنا ضروری ہے۔ اور خاص طور پر دل اور دماغ جس کا ہماری روح سے گہرا تعلق ہے اس کے لیے پاک اور صاف پانی کتنا اہم ہے۔

۱۹۹۹ء میں امریکہ کی نیشنل ریسرچ کاؤنسل نے موسمیات کے حوالے سے ایک رپورٹ تیار کی جس کا ٹائٹل "Research Pathways for the Next Decade" تھا۔ اس رپورٹ میں پانی کی اہمیت کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

Water is at the heart of both the causes and effects of climate change. Water is necessary to sustaining life and Earth and helps tie together the Earth's lands, oceans and atmosphere into an integrated system. Precipitation, evaporation, freezing, melting and condensation are all part of the hydrological cycle - a never ending global process of water circulation from clouds to land, to the ocean and back to the clouds. This cycling of water is intimately linked with energy exchanges among the atmosphere, ocean and land that determine the Earth's climate and cause much of natural climate variability. The impects of climate change and variability on the quality of human life occur primarily through changes in the water cycle.

آخر میں حضور پاک ﷺ کے وضو اور طہارت کے سلسلے میں چند ایک فرمودات ملاحظہ کریں۔

☆ ''جنت کی چابی نماز میں ہے اور نماز کی چابی طہارت (وضو) میں ہے۔'' (ترمذی)

☆ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے: ''جو شخص بھی وضو کے اوپر وضو برقرار رکھتا ہے اس کو دس گنا اجر ملے گا۔'' (سنن ابوداؤد۔ ترمذی اور ابن ماجہ)

☆ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ فرمایا: ''کیا میں تمہیں ایک ایسا عمل نہ بتاؤں جس کے کرنے سے اللہ تعالیٰ اس کے گناہ دور کر دے گا اور اس کے کئی درجات بلند کر دے گا؟'' صحابہ کرامؓ نے جواب دیا: اے اللہ کے رسول ضرور بتایئے۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا: ''مشکلات کے باوجود ایک عمدہ وضو کرنا۔'' (صحیح مسلم)

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ہر قسم کی طہارت اور پاکیزگی اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

تعارف وتبصرہ

(۱)

نام کتاب : Global Islamic Movement—— Why and How?

مصنف : شمیم اے صدیقی

شمیم صدیقی ایک نامور سکالر ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم سے بھی صدیقی صاحب کا گہرا تعلق رہا ہے۔ صدیقی صاحب کی امریکہ میں ڈاکٹر صاحب سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان ملاقاتوں میں گفتگو کا موضوع اُمتِ مسلمہ کا احیاء اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب کو صدیقی صاحب کی گفتگو پسندیدہ اور بھلی لگتی' کیونکہ ڈاکٹر صاحب بھی امت کی تعمیرِ نو کے لیے تاحیات مصروفِ عمل رہے۔ محترم شمیم صدیقی صاحب ہمارے پرچوں کے مستقل قارئین میں سے ہیں اور ان کا شمار تحریکی ذہن رکھنے والے ان بزرگوں میں ہوتا ہے جو عرصہ دراز سے امریکہ میں مقیم ہیں اور ملتِ اسلامیہ کے مسائل اور مستقبل کے بارے میں غور وفکر ہی نہیں کرتے' احیائے اسلام کے لیے مقدور بھر عملی کاوش میں بھی مصروف ومنہمک رہتے ہیں۔

صدیقی صاحب کئی انگریزی کتب کے مصنف ہیں' جن کے عنوانات حسبِ ذیل ہیں:

(a) The Commitment
(b) Methodology of Dawah ilallah in American Perspective
(c) The Dawa Program
(d) The Greatest Need of Man
(e) Looking for the Book of Wisdom
(f) The Revival of Ummah
(g) The Provision for Akhirah
(h) Al-Fateha & its Significance

ان تمام کتابوں کے عنوانات پر سرسری نگاہ ڈالنے سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ مصنف اُمت کو اس کا کھویا ہوا مقام بحال کرنے کے لیے کس قدر کوشاں ہیں۔ مصنف کی جملہ کتب قابل مطالعہ ہیں' لیکن زیرِ تبصرہ کتاب Global Islamic Movement بہت اہم تصنیف ہے۔ موصوف نے ابلاغ کے لیے انگریزی کو ذریعہ تبلیغ بنایا ہے تاکہ ان کی قرآن وسنت پر مبنی سوچ زیادہ تر حلقے تک نفوذ کر سکے۔ صدیقی صاحب اپنی ساری کتب

cost price پر سیل کرتے ہیں' کیونکہ ان کے پیش نظر دین اسلام کا پیغام پہنچانا ہے تاکہ امت مسلمہ اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکے۔

زیر تبصرہ کتاب کے سات ابواب ہیں' ہر باب کے ذیلی مباحث ہیں۔ یہ تمام مواد امت کے حوالے سے کرنٹ افیئرز پر مبنی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جدید ترین معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اکثر مقامات پر قرآن مجید کے حوالہ جات ہیں جس سے موصوف کا کتاب اللہ سے تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔ کتاب میں قرآنی اصطلاحات کا استعمال کیا گیا ہے' جیسے اُمَّةً وَّسَطا خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جو آیات حوالہ کے طور پر وارد ہوئی ہیں' ان کی صرف ٹرانسلیشن ہے۔ عالمی حالات وواقعات کا خصوصی طور پر ذکر ہے۔ Arab Spring کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔

کتاب جس موضوع پر مشتمل ہے' اس کا مطالعہ ہر اُس شخص کے لیے مفید ہے جو دین کی دعوت اور اس کی اقامت میں شریک ہے' کیونکہ داعی کے لیے ضروری ہے کہ دیگر افراد اور جماعتوں کے بارے میں واقف ہو جو دین کی جدوجہد میں شریک ہیں۔ قرآن مجید میں دعوت کے حوالے سے "علٰی بصیرۃ" کا ذکر ہے جو اس بات کا متقاضی ہے کہ داعی کی آنکھیں کھلی ہوں اور وہ دنیا میں اسلام کے حوالے سے پیش آنے والے واقعات کو بخوبی جانتا ہو۔

کتاب کا Foreword کے محمد رفعت کا تحریر کردہ ہے' جو زندگی نو (اردو' انڈیا) کے ایڈیٹر ہیں۔ پیش لفظ کے بعد کئی اہلِ علم اور دانشوروں کی کتاب کے بارے مثبت آراء کا ذکر ہے۔ ان رائے دینے والوں میں سابق امیر جماعت اسلامی سید منور حسن اور ڈاکٹر کوکب صدیقی ہیں جو امریکہ سے نکلنے والے میگزین "New Trend" کے ایڈیٹر ہیں۔ ڈاکٹر کوکب نے اپنے تاثرات میں ذکر کیا ہے کہ شمیم اے صدیقی مولانا مودودیؒ اور ڈاکٹر اسرار احمدؒ جیسے مصلحین سے بے حد متاثر ہیں۔ مختصر طور پر ڈاکٹر جاوید جمیل کے بھی تاثرات نقل ہیں جو کہ کئی کتب کے خود بھی مصنف ہیں۔ ان آراء سے ہی کتاب کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اہلِ علم کی آراء کے بعد مصنف کی جانب سے preface ہے جس کے مطالعہ سے کتاب کے بارے آگہی ملتی ہے۔ کتاب کے آخر میں دو Appendix ہیں۔ ایک مسلم پاپولیشن کے بارے میں چارٹ ہے جس سے ہر ملک میں پائے جانے والے مسلمانوں کی تعداد مذکور ہے۔ اس ڈیٹا کو موصوف نے مستند شماریات کے ذرائع سے حاصل کیا ہے۔ یہ چارٹ دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ صدیقی صاحب کی یہ تصنیف تحقیقی نقطہ نظر کے حوالے سے بھی اہم ہے۔ دوسرا ضمیمہ بعض ضروری عوامل پر مشتمل ہے جن کو مسلمانوں کو سرفہرست رکھنا چاہیے اور وہ امت کی ترجیحات ہونی چاہیے۔

بالکل آخر میں ایک عہد نامہ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان عملی طور پر امت اور انسانیت کی بہتری کے لیے قدم اٹھائیں اور مل جل کر کام کریں۔ ایک دوسرے کے لیے لوگ معاون ثابت ہوں۔ لوکل سطح پر یونٹس قائم کریں تاکہ ہم وحدت اور یکجہتی کی طرف سفر شروع کر سکیں۔

زیر نظر کتاب میں انہوں نے دورِ حاضر اور بالخصوص مغرب میں مسلمانوں کی احیائی تحریکات کا نہ صرف

جائزہ لیا ہے بلکہ آئندہ کے لیے عملی لائحہ عمل کے خطوط بھی واضح کیے ہیں۔اس سلسلے میں انہوں نے نظریاتی اور فکری میدان میں کام کی اہمیت کو زیادہ اجاگر کیا ہے۔ہم ان سے اس اعتبار سے متفق ہیں کہ اسلام اور ملّتِ اسلامیہ کا درد رکھنے والے مسلمانوں کو جو مغرب میں مقیم ہیں' احیائے اسلام کے لیے جن گوشوں میں کام کرنا چاہیے اس کی انہوں نے اچھے انداز میں نشاندہی کی ہے۔اس لیے کہ وہاں رہتے ہوئے نظریاتی سطح پر ہی جہاد ممکن ہے اور اس کے لیے مسلمانوں کے پاس ایک بہترین ہتھیار اور آلہ قرآن حکیم کی صورت میں موجود ہے۔ مکی دور میں آنحضور ﷺ کو اسی شمشیر قرآنی کے ذریعے جہاد کرنے کی تلقین فرمائی گئی تھی۔

مصنف سے اس ای میل ایڈریس پر رابطہ کیا جاسکتا ہے: tsidd96472@aol.com

اور مصنف کے بارے میں تفصیلی تعارف ان کی ویب سائٹ سے معلوم کیا جاسکتا ہے' ویب سائٹ کا ایڈریس یہ ہے: www.dawahinamericas.com

(تبصرہ نگار: ڈاکٹر ابصار احمد)

(۲)

نام کتاب : جواہر التجوید

مصنف : قاری عبدالرحمٰن

ضخامت : ۱۵۲ صفحات' قیمت : درج نہیں

ملنے کا پتہ : مکتبہ قدوسیہ' غزنی سٹریٹ' اردو بازار' لاہور

مصنف کو علم التجوید کے ساتھ گہرا شغف ہے۔وہ فن کی باریکیوں اور دیگر تفصیلات سے پوری طرح آگاہ ہیں۔احادیثِ نبویہؐ میں قرآن مجید کو خوبصورتی کے ساتھ پڑھنے کی تلقین ہے۔مصنف نے اس کتاب میں تجوید کا علم سیکھنے کی خواہش رکھنے والوں کے لیے تسلی بخش مواد جمع کر دیا ہے۔

مضامین کے چند عنوانات اس طرح ہیں: تجوید کی چند ضروری اصطلاحات' لحن اور اس کی اقسام' مخارج اور اصولِ مخارج کی تفصیل' حرف ضاد کی صحیح ادائیگی کا طریقہ' میم کی مختلف حالتیں' نون کی مختلف حالتیں' ادغام کا بیان' مد کی اقسام' ہمزہ کے احکام' وقف کی اقسام' سکتہ' رموزِ اوقاف' قرآن مجید کے چند مخصوص کلمات کی وضاحت۔اس کے علاوہ فن تجوید سے متعلق ہر قسم کی ضروری معلومات اور ہدایات دی گئی ہیں۔مخارج کی تفہیم کو تصاویر کے ذریعے آسان کیا گیا ہے۔

یہ کتاب نہ صرف طلبہ کے لیے بلکہ تجوید پڑھانے والے اساتذہ کے لیے بھی راہنما ہے۔کتاب جامعیت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔کمپوزنگ بھی خوبصورت اور طباعت معیاری ہے۔

(۳)

نام کتاب : شرح مقدمہ صحیح مسلم' جلد اول۔شرح مقدمہ صحیح مسلم' جلد دوم

مصنف : مولانا عبدالقیوم حقانی

ضخامت جلد اوّل : ۵۷۴صفحات۔ جلد دوم:۵۲۸صفحات' قیمت: درج نہیں

ملنے کے پتے : ☆سردار پلازہ' اکوڑہ خٹک' ضلع نوشہرہ ☆مکتبہ سید احمد شہید' اردو بازار لاہور

☆مکتبہ عمر فاروق' شاہ فیصل کالونی' کراچی

صحیح مسلم حدیث کی چھ مستند ترین کتابوں میں بخاری شریف کے بعد شمار ہوتی ہے۔ یہ دینی مدارس کے نصاب کی اہم کتاب ہے۔زیر تبصرہ کتاب کے مصنف مولانا عبدالقیوم حقانی سالہا سال سے حدیث پڑھا رہے ہیں۔ وہ قابلِ استاد' فاضل اجل' صاحبِ طرز ادیب اور کئی وقیع کتابوں کے مصنف ہیں۔علمی حلقے میں وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ان کی کئی کتابیں مدارس اسلامیہ میں قبولیت حاصل کر چکی ہیں' مثلاً شرح شمائل ترمذی' توضیح السنن شرح آثار السنن۔شرح مقدمہ صحیح مسلم جلد اول کے ابتدا میں حدیث سے متعلقہ اہم مباحث ہیں جن میں حجیت حدیث' حدیث کی کتابت اور تدوین' صحاحِ ستہ کے مؤلفین کا مختصر ذکر اور دیگر متعلقہ موضوعات شامل ہیں۔صحیح مسلم کے مؤلف ابوالحسن مسلم بن حجاج کے اخلاق و عادات' اوصاف و کمالات کے ساتھ ساتھ ان کا حدیث کے ساتھ شغف بھی بیان کیا گیا ہے۔صحیح مسلم کا مختصر مگر جامع تعارف بھی درج کیا گیا ہے۔اگرچہ صحیح بخاری کو حدیث کی باقی کتابوں پر تفوق حاصل ہے تاہم کئی اعتبارات سے جزوی طور پر صحیح مسلم کو صحیح بخاری پر فوقیت حاصل ہے۔

اہم تمہیدی مباحث کے بعد مقدمے میں شامل احادیث کی اس طرح شرح کی گئی ہے کہ ہر لفظ کا مفہوم و مطلب واضح ہو جائے۔ چونکہ حقانی صاحب عمر بھر مدرس رہے ہیں اس لیے ان کے انداز تفہیم میں مہارت بھی ہے اور دلچسپی بھی۔ نبی اور رسول' الحمد اور شکر' حدیث' خبر اور شہادت' بشیر اور بشیر جیسے الفاظ کے معانی اور مفاہیم کا بھی فرق واضح کر دیا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف دینی مدارس کے اعلیٰ درجات کے طلبہ کے لیے انتہائی مفید ہے' بلکہ حدیث کے مدرسین بھی اس کے مطالعے سے اپنے سبق کو مفید تر بنا سکتے ہیں۔

مقدمے میں شامل احادیث کی تشریح تو حصہ اول میں کر دی گئی ہے تاہم مزید پختگی کے لیے جلد دوم کفایت کرے گی۔جلد دوم کے آغاز میں جرح و تعدیل پر ہمہ پہلو بحث کی گئی ہے۔فن اسماء الرجال کی انفرادیت بیان کرتے ہوئے راویانِ حدیث کے کردار و عمل' یادداشت' قوتِ حافظہ' دیانت اور سختی کے ساتھ جانچنے کے اصول و قواعد بتائے گئے ہیں۔علم جرح و تعدیل پر مشتمل کتابوں کی فہرست بھی دی گئی ہے۔مقدمہ صحیح مسلم کے ۲۹۷ راویوں کے حالات اور ان کے فضل و کمال کا ذکر ہے۔

(تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ)

رسولِ اکرم ﷺ کی عظمت، آپؐ کے مقصدِ بعثت، اسوۂ رسول ﷺ کے قرآنی تصور، سیرتِ نبوی ﷺ کے مختلف گوشوں، خاص طور پر آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے انقلابی پہلو جیسے علمی و عملی موضوعات پر 9 کتابوں کا مجموعہ

رسولِ اکرم ﷺ اور ہم

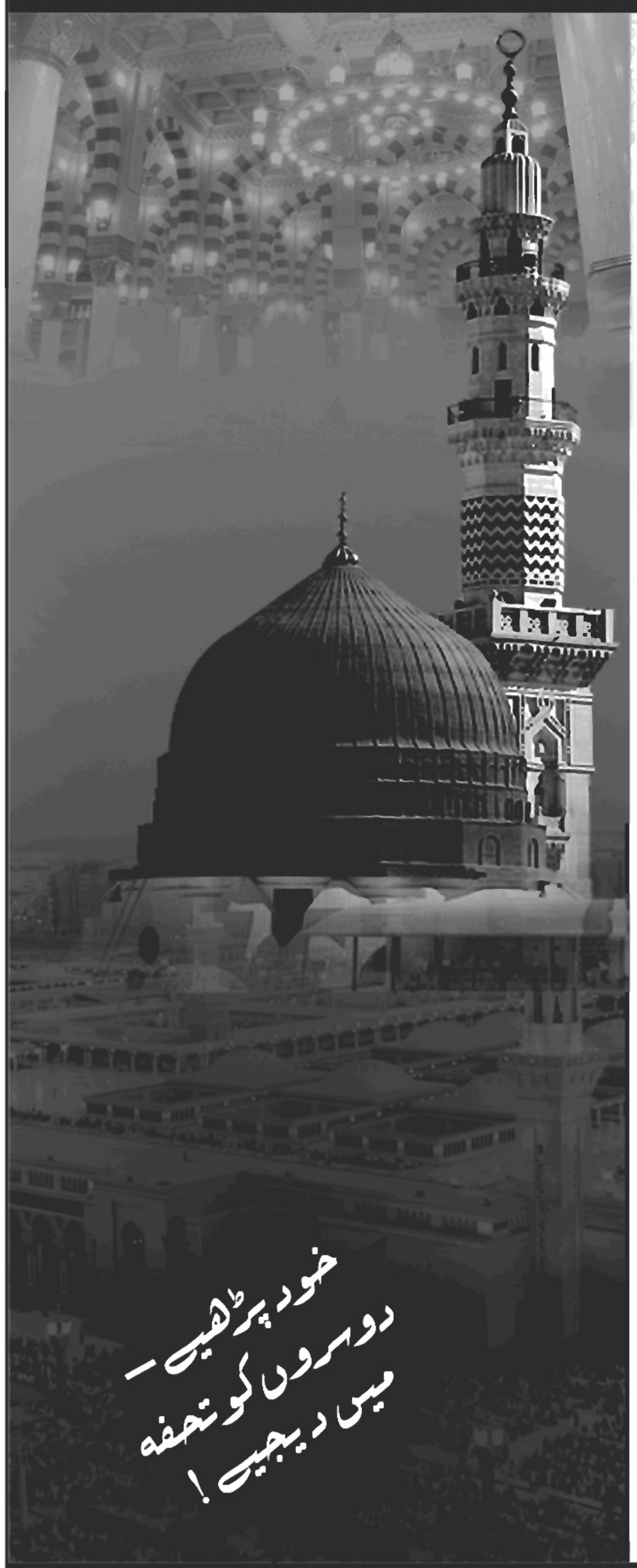

از ڈاکٹر اسرار احمدؒ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ

516 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

اشاعت خاص (مجلد):

امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 450 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):

امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 300 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-042-35869501

maktaba@tanzeem.org

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

Surah An-Nisa — cont....

(Ayaat 88-100, inclusive)

Translator's Note:

For the sake of continuity and coherent explanation, most of the general discourse has been made by employing the 'male' as a prototype, which is in no way meant to be diminutive of the opposite gender or to disrespect the status of women.

Moreover, each verse (Ayah) has been kept as a continuum in order to prevent the misrepresentation of meanings, which may occur when the verses are broken up and the translation of those verses becomes kaput when done in bits and pieces.

Cross-references taken from other parts of the Qur'an and the Hadith of the Messenger of Allah (SAW) are provided in italics.

The Translation of the Holy Qur'an done by the Message International – USA (www.FreeQuran.com) and edited by Saheeh International – UK, Dar Al Mountada – Saudi Arabia and Al Qummah – Egypt has been used in order to synchronize the use of modern English Language, which we believe will give a more accomplished sense of understanding to Today's mind.

Recap from the previous issue: verses 71 – 87:

The reader would recall that we had concluded our previous translation and elucidation of Surah An-Nisa (Women) at verse 87. The underlying message of those 17 verses was not just a continuation of the charge sheet against the wicked and preposterous claims and deeds of the Munafiqun (hypocrites), rather it also identified as the love for wealth and children alongside the hatred to spend monies

and lives in the way of Allah (SWT), particularly at times when the call for Qita'al (The element of Jihad where one is engaged with the enemy in the battlefield) was made. The verses concluded by advising Muslims not to be impressed by the skills of oratory of such hypocrites and remain focused on the divine revelations (both overt and covert) that were being taught to them by the Almighty (SWT) through the venerable person of the Prophet (SAW). Furthermore, the verses informed the ignominy and ordeal that awaited the hypocrites both in this world and particularly in the Hereafter, viz., the torment of Hellfire.

Fresh Exposition: verses 88 through 100 of Surah An-Nisa.

The following few verses are fundamental concerning the attitude of the hypocrites towards the Muslims. After the emigration of the Prophet (SAW), some of the hypocrites who had embraced Islam in Makkah did not migrate to Madinah, while others who had joined the bandwagon of Islam also started to show their true colours of an intrinsic enmity against Islam and the charismatic personality of the Prophet (SAW). They professed to be Muslims but gave their support to the enemies of Islam and took part in activities against the Muslims. The Muslims in Madinah were divided into two groups regarding the way they should deal with these hypocrites. Therefore, Allah (SWT) revealed these instructions and told them how to deal with them.

Verse 88

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝۸۸

"[Believers], why are you divided in two parties/groups about the hypocrites, when Allah Himself has rejected them because of what they have done? Do you want to guide those whom Allah has left to stray? If Allah leaves anyone to stray, you [Prophet] will never find a way for him."

Allah (SWT) criticizes the believers for dividing into groups concerning those hypocrites who did not migrate with the Prophet (SAW) to Madinah and instead stayed behind because they loved their homes and relatives more than Allah's (SWT) commandments. Therefore, Allah (SWT) made them revert back to disbelief because of their disobedience and their love of this world.

Moreover, it adds by declaring that those who are condemned to stray from the right path will never find a way to guidance and no one will be able to help them.

Verse 89

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۙ﴿۸۹﴾

"They would dearly like you to reject faith, as they themselves have done, to become like them. So do not take them as allies until they migrate [to Madinah] for Allah's cause. If they turn [on you], then seize and kill them wherever you encounter them. Take none of them as an ally or supporter."

The hypocrites had so much hatred for the Muslims and Prophet Muhammad (SAW) that they wanted them to revert to disbelief as they have and thus become all alike in misguidance. Allah (SWT) then prohibits the believers from taking as friends or protectors from amongst the hypocrites until they migrate in Allah's (SWT) cause and thus become true believers.

This ayah clearly indicates that the hypocrites, who did not migrate with the Muslims, should be treated as a member of the community at war with the Muslims i.e. the idolaters. They have more love for their tribal identity and their relatives than Islam and its followers. Therefore, they should all be treated as enemy combatants and are entitled to the same punishment as that of the idolaters and infidels.

Verse 90

اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴿۹۰﴾

"Except those who seek refuge with people with whom you have a treaty, or who come over to you because their hearts shrink from fighting against you or against their own people. And had Allah willed, He would have given them power over you, and they would have fought you. So if they withdraw and do not fight you, and offer you peace, then Allah gives you no way against them."

This verse sets the exceptions to the rule stated in the previous one. Allah (SWT) has commanded the Muslims to honour their treaties and pacts that are made with the disbelievers and thus if any of the hypocrites take refuge with the people with whom they have a treaty, then it is not allowed for the Muslims to pursue them or kill them.

Another exception is of those who are neither with the Muslims nor with the disbelievers because they do not want to fight along with the Muslims against their own tribes and their people.

The verse culminates as Allah (SWT) reminds of His benevolence on even those whose action were hypocritical during the whole episode by declaring that it could have been that they would have fought against the Muslims, but Allah (SWT) bestowed His mercy on His Prophet (SAW) and his followers and held back the hypocrites from fighting against them. Therefore, Allah (SWT) commands the Muslims not to kill them if they offer peace to you and refrain from fighting with you.

Verse 91

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝

"You will find others who wish to be safe from you, and from their own people, but whenever they are back in a situation where they are tempted [to fight you], they succumb to it. So if they neither withdraw, nor offer you peace, nor restrain themselves from fighting you, seize and kill them wherever you encounter them: We give you clear authority against such people."

In the previous ayah, Allah (SWT) commanded the Muslims not to kill those hypocrites who did not fight against them nor did collaborate with the disbelievers. But Allah (SWT) informs the Muslims in this ayah that amongst them too there are those who plunge into mischief whenever they get an opportunity and side with the disbelievers when they see that that they appear to be having an upper hand against the Muslims. Allah (SWT) declares such hypocrites not immune from punishment and gives an absolute authority to the Muslims to treat them as enemy combatants and thus pursue and kill them. Over such men, Allah (SWT) gives Muslims absolute authority.

Verse 92

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ؕ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ؕ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۙ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾

"Never should a believer kill another believer, except if it happens by mistake. If anyone kills a believer by mistake he must free one Muslim slave and pay compensation to the victim's relatives, unless they charitably forgo it; if the victim belonged to a people at war with you but is a believer, then the compensation is only to free a believing slave; if he belonged to a people with whom you have a treaty, then compensation should be handed over to his relatives, and a believing slave set free. Anyone who lacks the means to do this must fast for two consecutive months by way of repentance to Allah: Allah is all knowing, all wise."

This ayah describes the expiation of a Muslim killing another Muslim by mistake. If he kills a believer accidentally then, firstly, he has to free a believing slave as expiation. Secondly, blood money will have to be paid to the family of the deceased as compensation for the loss that they have suffered, unless the family of the deceased gives up the blood money willingly. If the deceased was a believer but belonged to a hostile nation then only the freeing of a believing slave is enough to earn forgiveness from Allah (SWT), and no blood money should be paid. But if the murdered person belonged to a tribe with whom they have a treaty then both the conditions, freeing of a believing slave and compensation to the family of the deceased, will be fulfilled.

The verse goes on to state that whosoever of such people can not afford to free a believing slave or pay the compensation to the family of the deceased then he has to fast consecutively for two months as penance for the sin he has committed. And surely Allah (SWT) knows those who repent sincerely.

Verse 93

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

"If anyone kills a believer deliberately, the punishment for him is Hell, and there he will remain: Allah is angry with him, and rejects him, and has prepared a tremendous torment for him."

Logically, this verse is a mirror image of sorts of the previous one as it mentions the ruling of the punishment for killing a believer intentionally.

Killing a believer deliberately is indeed one of the gravest of major sins in Islam, as it was narrated that Ibn Umar (RA) said: The Messenger of Allah (SAW) said:

> *"The believer will continue to have a good chance of salvation so long as he does not shed haram (unlawful) blood."*

Those who commit murder shall incur the wrath of Allah (SWT) upon them in this world and a great punishment awaits them in the Hereafter, where they will be thrown in the Hellfire forever.

Verse 94

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۭ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝

"O you who believe, be careful when you go to fight in Allah's way, and do not say to someone who offers you a greeting of peace, 'You are not a believer,' you desire for the chance gains of this life – Allah has plenty of gains. You yourself were in the same position [once], but Allah was gracious to you, so be careful: Allah is fully aware of what you do."

At the time of the Prophet (SAW) a stranger would use to greet another Muslim by saying "Assalam-o-Alaikum" as a symbol of recognition, so that he should not show enmity towards him. But some of the Muslims suspected some of such people to be disbelievers who only greeted the Muslims to save themselves. *(Translator's Note: Although it happened only occasionally).*

Later, Allah (SWT) revealed this ayah and commanded the believers not to kill any person who declares that he is a Muslim without thorough investigation because it may be possible that he is telling the truth and he has indeed become a believer.

The verse goes on to educate Muslims that they will get much more benefit if they obey Allah (SWT) and follow His (SWT) commandments than these worldly riches for which they killed that person.

The verse culminates with a psychological overtone as it impresses upon Muslims that they themselves were disbelievers once but Allah (SWT) bestowed His grace upon them and guided them to the right path. It is now their duty, therefore, to make a thorough investigation, whether the person who pronounced his faith is speaking the truth or not before they come to any conclusion, one way or the other. In fact, Allah (SWT) is well aware of the actions of everyone and cognizant of what each does.

Verse 95

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ أَجْرًا عَظِيْمًا ۙ﴿۹۵﴾

"Those believers who stay at home, apart from those with an incapacity, are not equal to those who commit themselves and their possessions to striving in Allah's way. Allah has raised such people to a rank above those who stay at home – although He has promised all believers a good reward, those who strive are favoured with a tremendous reward above those who stay at home"

As mentioned in the earlier (verses 71 – 87), fighting in Allah's way was not made obligatory before the battle of Tabuk, and they were asked to do Jihad on voluntary basis.

In this ayah Allah (SWT) again encourages the believers to join the Prophet (SAW) in Jihad with their wealth and their lives. Allah (SWT) assigns them a higher status than those who stay behind and do not take part in it.

It does not, however, condemn those who stayed behind from participating in Jihad, when it was not made obligatory, but does state that they are much lesser in rank than those who engage their wealth and their lives for Jihad in Allah's (SWT) cause, yet Allah (SWT) promises them a good reward if all who are engaged in good deeds.

Verse 96

دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾

"High ranks conferred by Him, as well as forgiveness, and mercy: Allah is most forgiving and merciful."

In continuation of the previous verse, this one act as a force-multiplier for those who engage in Jihad with their persons and wealth, whether it has been made obligatory yet or not. It states the higher status and rank that they possess.

Verse 97

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۹۷﴾

"When the angels take the souls of those who have wronged themselves, they ask them, 'In what business were you (involved)?' They reply, 'We were oppressed in this land,' and the angels say, 'But was Allah's earth not spacious enough for you to migrate to some other place?' These people will have Hell as their refuge, an evil destination,"

Verse 97 again reverts to the subject of those people who embraced Islam but did not migrate to Madinah with other Muslims and chose to stay behind with their disbelieving relatives and tribes. It states that when death comes upon any of them, they will be questioned as to what was the reason that they did not migrate in the way of Allah (SWT) and continued to prefer their families, properties and other interests than Islam.

They will give the excuse that we did not migrate because we were oppressed and weak. But as excuse as lame as that will not be accepted from them because Allah (SWT) has made this earth spacious enough for anyone to migrate and go somewhere else to escape the law of unbelief. Consequently, they will be thrown into the Hellfire, which is indeed an evil refuge. Hell shall be their home: an evil fate.

Verse 98

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۹۸﴾

"but not so the truly helpless men, women, and children who have no means in their power nor any way to leave."

An exception to the rule is stated in this verse that for those who are weak amongst men, women and children and can not free themselves from the idolaters nor can they afford to migrate would be spared by Allah's (SWT) mercy.

Verse 99

فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَن يَعْفُوَ عَنْهُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا ﴿٩٩﴾

"Allah may well pardon these, for He is most pardoning and most forgiving."

This oft-repeated verse of the Qur'an, stating that Allah (SWT) encourages His servants to repent and hope for His (SWT) forgiveness is self-explanatory.

Verse 100

وَمَن يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً ۚ وَمَن يَخْرُجْ مِن بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٠٠﴾

"Anyone who migrates for Allah's cause will find many a refuge and great plenty in the earth, and if anyone leaves home as a migrant towards Allah and His Messenger and is then overtaken by death, his reward from Allah is sure. Allah is most forgiving and most merciful."

The verse encourages the believers to migrate in Allah's (SWT) cause. If they live in a place where they are oppressed and tortured, then they should find refuge in any of the numerous places on earth that Allah (SWT) has provided them with. In fact, whoever migrates for Allah's (SWT) cause but dies on the way, Allah (SWT) promises him the reward equal to those who migrated.

The final part of this verse consists of the oft-repeated and self-explanatory expression of the Qur'an that Allah (SWT) forgives the sins and shortcoming of Muslims and is the Most Compassionate, the Most Merciful.

And Allah *(SWT)* Knows Best!

اسلامی نظریہ حیات[1]

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

اسلامی نظریہ حیات ہی وہ واحد نظریہ ہے کہ جس میں انسانی زندگی کی ابتداء وانتہاء (Alpha and Omega)، مقصد زندگی، طرز حیات، تاریخ، لسانیات (Linguistics)، علمیت (Epistemology) اور اخلاقیات وغیرہ کے بارے اس قدر تفصیلی اور واقعی معلومات موجود ہیں کہ اس پر "Theory of Everything" کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اس تحقیقی مضمون میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اسلامی ضابطہ حیات کی روشنی میں اسلام کا عالمی نقطہ نظر (world view) اصولی انداز میں اس طرح پیش کر دیا جائے کہ یہ دین کی روایتی فکر کا ایک جامع اور مختصر بیانیہ (narrative) بن جائے۔

اعتزال، جدیدیت، مابعد جدیدیت، دہریت، خوارجیت اور انتہا پسندی کے عوامل کے نتیجے میں پچھلے دس سالوں میں دور جدید کے علمی وفکری فتنوں کو گہرائی میں پڑھنے سننے کا موقع ملا کہ جس سے عقیدہ کا جدید اسلوب میں ایک ایسا مختصر اور جامع متن تیار کرنے کا جذبہ پیدا ہوا کہ جس میں ان فتنوں کا بھرپور استدلالی جواب موجود ہو۔ معلوم نہیں یہ مقصد کس حد تک پورا ہو پایا ہے؟ لیکن مصنف نے اس کے لیے محنت ضرور کی ہے کہ جس کا احساس اس مضمون کے مطالعے کے بعد ان لوگوں کو ضرور ہو گا جو ان فتنوں اور ان کے پیدا ہونے والے اثرات سے بخوبی آگاہ ہیں۔

اس بیانیے کا ہر ہر جملہ ایک ایسی فکر کا حامل ہے کہ جس میں کسی فتنے کا رد موجود ہے یا کسی اہم سوال کا جواب پوشیدہ ہے۔ اور متن کا ہر جملہ دوسرے کے ساتھ نہ صرف لفظاً ومعناً مربوط ہے بلکہ اس کے لیے ایک دلیل بھی ہے۔ بیانیے کا متن اگرچہ مختصر ہے لیکن حواشی میں بیانیہ کی دلیل اور استدلال تفصیل کے ساتھ کتاب وسنت سے نقل کر دیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر اہل علم کی آراء بھی منقول ہیں لیکن ان کا عربی سے اردو ترجمہ نہیں کیا گیا، نہ ہی دلالت کی نوعیت کو واضح کیا گیا ہے جبکہ بعض مقامات پر محض اشارات کر دیے گئے ہیں تاکہ اہلیت نہ رکھنے والے افراد بحث کو اس کے علمی معیار سے نیچے نہ لا سکیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ اہل مغرب نے اپنے ہر علم، خواہ وہ سائنسی ہو سماجی، تاریخی ہو یا لسانی، کو نظریہ ارتقاء (theory of evolution) کی روشنی میں مرتب کر کے دکھا دیا ہے جبکہ اہل مشرق پر یہ فرض ہے کہ وہ ہر علم کو، چاہے وہ تاریخ ہو سائنس، نظریہ تخلیق کی روشنی میں مرتب کر کے دکھا دیں۔ اور جب تک ہمارے محققین فلسفہ، سائیکالوجی، بیالوجی، نظریاتی فزکس، عمرانیات، لسانیات اور تاریخ کے مضامین میں نظریہ تخلیق (Creationism) کی روشنی میں بحث وتحقیق کی بنیاد نہیں رکھ دیتے، اس وقت تک دنیاوی علوم سے مذہب کا مقدمہ ثابت کرنا ممکن نہیں ہے۔

مابعد جدیدیت (postmodernism) کی یہ خوبی ہے کہ اس نے نہ صرف فلسفہ، ادب، معاشیات، لسانیات اور تاریخ وغیرہ کو اپنے نقطہ نظر سے نہ صرف نئے سرے سے بیان کر دیا بلکہ اپنا میوزک اور آرٹ بھی پیدا کر کے دکھا دیا جبکہ اہل مذہب کو تو نئے سرے سے کچھ بھی تخلیق کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف پہلے سے موجود کام کو مرتب کرنا ہے۔ مثلاً نظریہ تخلیق کی روشنی میں اگر آپ نے انسان کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ہے تو "تاریخ الرسل والملوک" اور "دیوان المبتدا والخبر" کو دیکھا جا سکتا

ہے۔ اور اگر نظریہ تخلیق ہی کی روشنی میں معاشیات پر تحقیق کرنی ہے تو "الاموال" اور "الخراج" کو دیکھ لیں۔ خوارزمی نے "وراثت" کے مسائل حل کرنے کے لیے "الجبرا" (Algebra) ایجاد کیا اور اس بارے اس کی کتاب "الکتاب المختصر فی حساب الجبر والمقابلۃ" کا آخری باب دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کیا "خطاطی" (Calligraphy) آرٹ میں اور "مقامات" (Quranic Rhythms) میوزک کے بالمقابل ایسے اسلامی فنون نہیں ہیں جو انسان کی آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو حقیقی سکون بخشیں؟

اردو اور انگریزی حواشی کو بعینہٖ نقل کیا گیا ہے جبکہ عربی حواشی کی طوالت کی وجہ سے محض حوالہ کے بیان پر اکتفا کیا گیا ہے۔

میں اپنی یونیورسٹی کے ان جمیع ڈاکٹر صاحبان کا بھی شکر گزار ہوں، خاص طور فنز کس اور ریاضی کے، کہ جنہوں نے اس کتاب میں شامل بعض موضوعات پر گفت و شنید کے لیے وقت نکالا۔

■■■■■■■■■■■■

خالق اور مخلوق دونوں حقیقت ہیں۔[2] دہریت (atheism) علماً اندھا ایمان[3] (blind faith) اور منہجاً سوفسطائیت[4] (sophism) ہے جبکہ "تنزلات"[5] جہل مرکب[6] اور بدعت[7] ہیں۔

1- مبدا اور معاد (Entry and Exit):

انسان کے مبدا اور معاد کے بارے سب سے جامع اور منطقی جواب مذہب کے پاس ہے۔[8] ازل سے خالق تھا اور اس کے ساتھ کچھ بھی نہ تھا یہاں تک کہ اس نے سب سے پہلے پانی کو پیدا کیا اور اس کے بعد اس پر اپنا عرش بنایا۔[9] پانی اور عرش کے بعد سب سے پہلے جسے خالق نے پیدا کیا، وہ قلم ہے۔ اور اسے پیدا کرنے کے بعد خالق نے اسے قیامت تک جو کچھ ہونے والا تھا، اس کے لکھنے کا حکم دیا۔ اور اس لکھے ہوئے کو ہم تقدیر کے نام سے جانتے ہیں۔[10] اس کے بعد خالق نے زمین، پہاڑوں، سات آسمانوں، ستاروں اور دیگر مخلوقات کو چھ دنوں میں پیدا کیا[11] اور اپنے عرش پر مستوی ہوا۔[12] خالق اور مخلوق کا باہمی تعلق عبد و معبود کا ہے نہ کہ وہم و خیال یا عکس و ظلال کا۔[13]

اس دنیا میں انسان کا وجود کسی اتفاق (chance) یا حادثے (accident) کا نتیجہ نہیں بلکہ خالق وحدہ لاشریک کی ایک بامقصد تخلیق کا ظہور ہے۔[14] اور انسان کی پیدائش کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی عبادت اور بہترین عمل کے ذریعے اپنے خالق کا شکر ادا کرے۔[15] کائنات کے خالق نے مادہ نور سے فرشتوں، آگ سے جنات اور مٹی سے انسان کی تخلیق کی۔[16] اس نے فرشتوں اور جنات کی تخلیق کے بعد ایک تیسری مخلوق انسان کو پیدا کرنے اور اسے زمین میں خلیفہ[17] اور مسجود ملائک بنانے کا اعلان کیا۔[18] اور زمین کی مٹھی بھر مٹی[19] کے گارے کا جوہر[20] لے کر اپنے دونوں ہاتھوں سے[21] پہلے انسان [آدم] کا پتلا (statue) بنایا اور اسے جنت میں رکھا۔[22] اس کی نوک پلک سنوارنے کے بعد اس میں اپنی روح پھونکی،[23] اسے خلیفہ ہونے کے مقام

پر سرفراز کرنے کا اعلان فرمایا[24] اور مسجود ملائک ٹھہرایا۔[25] فرشتوں نے سجدہ کر کے آدم کے عالی مقام کو قبول کیا جبکہ جنات میں سے ابلیس نے آدم کے مرتبے سے حسد کیا اور اللہ کے دربار میں تکبر کا اظہار کرتے ہوئے نہ صرف سجدہ کرنے سے انکار کر دیا بلکہ آدم اور ان کی ذریت کے خلاف ابدی دشمنی کا بھی اعلان کر دیا۔[26]

خالق نے آدم کی پسلی ہی سے ان کے لیے جنس مخالف حوا کا جوڑا پیدا کیا اور پھر اس زمین میں ان دونوں سے کثیر تعداد میں نسل انسانی کو پھیلا دیا۔[27] مخلوقات کی پیدائش کے بعد ان کی افزائش نسل کے لیے خالق نے ہر جاندار شیء میں اصل "پانی" کو بنایا۔[28] شروع میں آدم اور حوا دونوں کو "آسمانوں کی جنت" میں رکھا گیا[29] جبکہ بعد ازاں اسی جنت کے حصول کے لیے امتحان کی غرض سے متعین مدت کے لیے زمین پر اتارا گیا[30] اور ایک "آسمانی ضابطہ حیات" عطا کیا گیا کہ جس کے مطابق زندگی گزارنے کو دنیاوی امتحان میں کامیابی کی شرط لازم قرار دیا گیا۔[31] دنیا کے امتحان میں کامیابی اور ناکامی کے اعلان کے لیے آخرت کا دن مقرر کیا گیا اور کامیاب لوگوں کے لیے ہمیشہ کی جنت کا وعدہ اور ناکام کے لیے جہنم کی وعید سنائی گئی۔[32]

قدیم انسان کی تاریخ پانچ ادوار میں منقسم ہے۔[33] پہلا دور آدم سے نوح، دوسرا نوح سے ابراہیم، تیسرا ابراہیم سے موسیٰ، چوتھا موسیٰ سے عیسیٰ اور پانچواں عیسیٰ سے محمد رسول اللہ تک ہے۔[34] آدم کو آسمانوں کی جنت[35] سے "ارض ہند" میں اتارا گیا[36] اور انہیں صنعت[37] اور زبان[38] دونوں سکھا کر دنیا میں بھیجا گیا۔ میدان عرفات میں "عہد الست" ہوا[39] اور آدم کی اولاد "مشرق" میں "شام" (mesopotemia) میں آباد ہوئی[40]۔

آدم اور نوح کے مابین دس نسلیں ہیں[41] جو "توحید" پر ایمان رکھنے والی تھیں۔[42] آدم کی اولاد میں پہلی مرتبہ "شرک" کا ظہور نوح کے زمانے میں ہوا[43] جبکہ وہ "شام" (mesopotemia) کے علاقے میں آباد تھے۔[44] "قوم نوح" کے شرک، سرکشی اور بغاوت کے نتیجے میں "طوفان نوح" کے ذریعے نسل انسانی ہلاک ہوئی اور اہل کشتی میں سے صرف نوح ہی کی نسل آگے جاری ہوئی۔[45] موجودہ نسل انسانی نوح کے تین بیٹوں سام، حام اور یافث کی اولاد ہیں۔[46] عرب سام، حبشی حام اور اہل روم یافث کی اولاد ہیں۔[47]

نوح اور ابراہیم کے مابین بھی دس نسلیں ہی ہیں۔[48] "قوم نوح" کی ہلاکت کے بعد "قوم عاد" ان کی جانشین بنی۔[49] "قوم عاد" کی ہلاکت کے بعد "قوم ثمود" ان کی جانشین ٹھہری۔[50] "قوم ثمود" کی ہلاکت کے بعد "قوم ابراہیم"، "قوم لوط" اور "قوم شعیب" ان کی جانشین قرار پائیں۔[51] ابراہیم کی بعثت کے بعد نبوت ان ہی کی ذریت میں رکھ دی گئی۔[52] ابراہیم سے موسیٰ اور موسیٰ سے عیسیٰ تک "نبوت اور کتاب" بنو اسحاق کے پاس رہی[53] اور محمد رسول اللہ سے بنو اسماعیل کو منتقل ہو گئی۔[54] اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت

سے "جدید انسان" (modern age) کی تاریخ کی ابتداء ہوئی۔

یہ اس دنیا کی ابتداء اور انتہاء ہے۔ پس سائنسی، انسانی اور عمرانی علوم (Humanities and Social Sciences) میں ہر وہ نقطہ نظر (worldview) کہ جس کی بنیاد اصول ثلاثہ "توحید"، "رسالت" اور "آخرت" نہ ہو، ظلمت ہے[55] اور ہر وہ علم کہ جس کا معلوم "اصول ثلاثہ" کا انکار ہو، جاہلیت ہے۔[56]

2-روایت اور فہم (Tradition and Hermeneutic):

خالق کی طرف سے دنیاوی زندگی گزارنے کے لیے نازل کیے گئے ابدی اور آسمانی ضابطہ حیات کو "دین اسلام" کا نام دیا گیا[57] اور اس کے علاوہ کسی بھی ضابطہ حیات کو قبول کرنے یا اس کے مطابق زندگی گزارنے کا انکار کر دیا گیا۔[58] ہر قوم کی طرف نبی اور رسول بھیجے گئے۔[59] آدم علیہ السلام سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء کا ضابطہ حیات ایک ہی تھا اور وہ "اسلام" ہے اگرچہ اس ضابطہ حیات کی تشریحات اور توضیحات کہ جسے "شریعت" کہتے ہیں، احوال وظروف میں تبدیلی کی وجہ سے مختلف ادوار اور اقوام میں متنوع رہی ہے۔[60] "شریعت" یعنی ضابطہ حیات کی تفصیلات اور جزئیات (code of life) کی طرح "منہاج" یعنی شریعت کو فرد و معاشرے میں جاری وساری کرنے کا طریق کار (way of life) بھی ہر قوم کے لیے مختلف رہا ہے۔[61] محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد قیامت تک کے لیے اللہ کا دین "اسلام"، شریعت "محمدی" اور منہاج "دعوت وجہاد" ہے۔[62] اور اب ان تینوں پر عرفاً "اسلام" کے لفظ کا اطلاق درست ہے۔

اس دین کے دو پہلو "روایت" اور "فہم" ہیں۔ جہاں تک "دین کی روایت" کی بحث ہے[63] تو حصول علم کے ذرائع (Means of Knowledge) میں سے مستند ترین اور جامع ترین ذریعہ "خبر" ہے اور "وحی" خبر ہی کی ایک قسم ہے۔[64] اگرچہ سابقہ آسمانی کتب میں آج بھی بعض مقامات پر اللہ کا حکم موجود ہے[65] لیکن چونکہ ان قوموں نے اپنی الہامی کتب اور نبیوں کی تعلیمات میں اخفاء اور اضافے[66] کے رستے لفظی ومعنوی تحریفات کر لی تھی[67] لہٰذا اب قیامت تک کے لیے، انسانوں کی اخروی نجات کی لازمی شرط، دین اسلام کو جاننے کا واحد محفوظ ذریعہ خالق کے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔[68] محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد گزشتہ پیغمبروں کی اقوام کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کی اتباع اخروی نجات کی لازمی شرط ہے[69] اور اللہ کے دین کو بیان کرنے میں آخری کتاب قرآن مجید سابقہ جمیع آسمانی صحائف پر نہ صرف حاکم ہے[70] بلکہ ان کی ناسخ بھی ہے۔[71] محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دین، قرآن مجید اور سنت نبوی دو صورتوں میں، بذریعہ خبر اس امت کو منتقل ہوا ہے اور "خبر

صحیح"[72] کے ذریعے اس دین کا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے امت کے کس فرد تک پہنچ جانا اس پر حجت قائم ہو جانے میں کافی ہے۔[73] قرآن مجید کی خبر کا ثبوت "اصول قراءات"، حدیث کا "اصول حدیث"، تفسیری اقوال کا "اصول تفسیر"، سیرت کا "اصول سیرت" اور تاریخ کا "اصول تاریخ" کی روشنی میں طے ہو گا۔[74]

اور رہی بات "دین کے فہم" کی تو لفظ و معنی کا تعلق لازم وملزوم کا ہے لہٰذا اس سے زیادہ لغو بات کوئی نہیں ہے کہ لفظ کا کوئی معنی نہیں ہوتا۔[75] زبان ابتداء میں "توقیف"[76] اور استعمال میں "وضع" ہے۔[77] اور قرآن مجید اور سنت نبوی دونوں وحی الٰہی ہیں اور دین اسلام کے بنیادی مصادر ہیں[78] اور عقیدہ و عمل یا حلال وحرام کے بیان میں ان دونوں سے ایسی حجت قائم ہوتی ہے کہ جس کی بنیاد پر انسان آخرت میں مسؤل قرار پائے۔[79] قرآن وسنت کا باہمی تعلق لفظ و معنی کا ہے۔[80] قرآن مجید اللہ کے الفاظ ہیں جبکہ سنت منشائے متکلم کے مطابق ان کا بیان ہے۔[81] قرآن مجید میں الفاظ تلقی وتلاوت[82] جبکہ سنت نبوی میں معنی تحمل واداء[83] کی صورت میں، قراءات اور حدیث کی اصطلاحات کے ساتھ، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم تک نسل در نسل منتقل ہوا ہے۔ قرآن مجید روایت باللفظ ہے جبکہ حدیث کہیں روایت باللفظ اور کہیں روایت بالمعنی ہے۔[84] قرآن مجید یا حدیث نبوی کے فہم میں سلف صالحین کا "منہج استدلال" حجت (binding) ہے[85] اور اگر نص کے کسی معنی پر مسلمان اہل علم کا اتفاق ہو جائے تو اس سے اختلاف گمراہی کا رستہ ہے۔[86] اجماع اور قیاس مظہر حکم ہیں نہ کہ مثبت شریعت۔[87] کلام میں اصل حقیقت ہے اور مجاز کے لیے قرینہ چاہیے۔[88] کلام کبھی محکم ہوتا ہے اور کبھی متشابہ[89] اور اس کی اپنے معنی پر دلالت کہیں قطعی ہے اور کہیں ظنی۔[90] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر اور اجتہاد دونوں حجت ہیں[91] جبکہ مفسر صحابہ کی "درایت تفسیری" حجت ہے[92] جبکہ "درایت اجتہادی" نہیں۔[93] اور فقہاء صحابہ کا اجتہاد اور فتوی معتبر ہے۔[94] خیر القرون میں ہی کتاب وسنت کے فہم کے دو اجتہادی مناہج دو مکاتب فکر، اہل الاثر اور اہل الرائے، کی صورت میں حجاز اور عراق میں وجود میں آئے۔[95] اہل الاثر کی ریاست امام مالک رحمہ اللہ اور اہل الرائے کی امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے حصے میں آئی۔[96] اہل الاثر سے مالکی، شافعی، حنبلی اور ظاہری مکاتب فکر جبکہ اہل الرائے سے حنفی مکتبہ فکر کی ابتداء پڑی۔[97] اور عصر حاضر کے حالات وتقاضوں کے مطابق دین کی تعبیر و تشریح کے بیان میں کسی علمی روایت سے تمسک ضروری ہے[98] ورنہ تو ہر اس تعبیر دین یا بیانیے کی مثال ایک کٹی پتنگ کی سی ہو گی کہ جس کی سند دو چار واسطوں کے بعد منقطع ہو جاتی ہو۔[99] علماء کے لیے "اجتہاد"[100] جبکہ عوام کے لیے "اتباع"[101] واجب ہے۔[102]

3-علم اور قوت (Power and Knowledge):

علم، توحید کی معرفت ہے [103] اور جس کا نتیجہ توحید کا انکار ہو، وہ علم نہیں جہالت ہے۔ [104] پیغمبروں کی بعثت کا مقصد خالق کے دیے ہوئے ضابطہ حیات کی نہ صرف تبلیغ تھی کہ فرد اپنے خالق کی بندگی اختیار کرے، طاغوت سے اجتناب کرے [105] اور اس پر آخرت میں اس بارے مسؤل (accountable) ہونے کے باب میں حجت قائم ہو [106] بلکہ اس کا نفاذ بھی تھا تاکہ معاشرے سے ظلم کا خاتمہ ہو اور اس میں عدل کا نظام قائم ہو۔ [107] لہٰذا دلیل اور قوت دونوں صورتوں میں پیغمبروں کا غلبہ مقصود رہا ہے۔ [108]

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے دو مقاصد تھے: تلاوت آیات اور تعلیم کتاب و سنت کے ذریعے فرد کا تزکیہ نفس [109] اور جہاد و قتال کے ذریعے بقیہ جمیع ادیان پر دین اسلام کا غلبہ۔ [110] اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی وراثت، علماء [111] اور خلافت، امراء کو منتقل ہوئی۔ [112] "اجتہاد" اور "جہاد" دین کی دو بنیادی اصطلاحات ہیں اور اجتہاد کا مطلوب دلیل میں اسلام کا غلبہ [113] ہے جبکہ جہاد کا مقصود قوت میں اسلام کو غالب کرنا ہے۔ [114]

اور دین کی حفاظت اور فروغ کے دو ذرائع ہیں: علم [115] اور قوت۔ [116] خالق نے علم کے ذریعے دین کی حفاظت فرمائی [117] اور قوت کے ذریعے اہل دین کی۔ [118] دین کے فروغ کا منہج دعوت و جہاد ہے اور یہ دونوں قیامت تک جاری رہیں گے۔ [119] اہل دین مغلوب ہوں تو دعوت و تبلیغ اصل منہج ہے [120] اور اگر غالب ہوں تو مسلم معاشرے میں پیدا شدہ بگاڑ کی اصلاح کے لیے ہر مومن سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا تقاضا ہے [121] جبکہ غیر مسلم معاشروں کو مغلوب و مفتوح کرنے کے لیے جہاد و قتال کا تاکہ اس کے نتیجے میں مخلوق کا مخلوق پر ظلم ختم ہو اور خالق کا عدل قائم ہو۔ [122] معروف وہ ہے کہ جس کا شارع نے مطالبہ کیا ہو اور منکر وہ ہے کہ جس سے شارع نے منع کیا ہو۔ [123] مسلمانوں کے لیے امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے [124] جبکہ جہاد غیر مسلموں سے ہے لہٰذا نہ تو مسلمانوں کی باہمی لڑائی جہاد ہے [125] اور نہ ہی مسلمان حکمران کے خلاف خروج جائز ہے۔ [126] مسلمانوں کا باہمی علمی و سیاسی افتراق و انتشار مذموم جبکہ اتفاق و اتحاد مطلوب ہے لہٰذا اجماع کے حصول اور ریاست ہائے متحدہ اسلامی کے قیام کے جدوجہد دین کا بنیادی تقاضا ہے۔ [127]

حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت ارضی اور آسمانوں سے نزول کے بعد اس کرہ ارضی پر جب نسل انسانی کا آغاز ہوا [128] تو سب انسان ایک ہی ضابطہ حیات "اسلام" کے پیرو تھے جبکہ بعد ازاں اپنی خواہش نفس اور شیطان کے بہکاوے میں آکر بعض انسانوں نے خالق کے دین سے اختلاف کا رستہ اختیار کیا۔ [129] آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں میں جب کسی مسئلے میں باہمی اختلاف ہوا اور ایک نے غصے میں آکر دوسرے کو قتل کرنے کی خواہش کا

اظہار کیا تو مقتول نے قتل کے فعل کو نہ صرف گناہ بلکہ جہنم میں داخلے کا سبب بھی قرار دیا[130] کہ جس سے سورۃ بقرۃ کی آیت مبارکہ [131] میں معہود ضابطہ حیات کی موجودگی اور اس سے انحراف کے نقطہ آغاز کا علم ہوتا ہے۔[132]

پس خالق نے اپنے ابدی ضابطہ حیات کی حفاظت اور فروغ کے لیے انبیاء ورسل کی بعثت اور آسمانی صحف وکتب کے نزول کا سلسلہ جاری فرمایا کہ جس کے دو مقاصد تھے؛ ایک مقصد تو انذار وتبشیر اور دعوت و تبلیغ کے رستے انسانوں کو خالق کے ضابطہ حیات کے بارے آگاہ کرنا اور دوسرا انسانوں کے باہمی اختلافات میں خالق کے حکم کے مطابق فیصلہ فرماتے ہوئے اس کے ابدی دین کو انسانی معاشروں میں جاری وساری کرنا۔[133] حضرت آدم علیہ السلام اسی معنی میں خالق کے نبی اور خلیفہ تھے۔[134] اور حضرت داؤد علیہ السلام کے بیان میں تو نص صریح موجود ہے کہ نبی کے خلیفہ ہونے سے خالق کی مراد یہ ہے کہ وہ خالق کے حکم کو اس کی مخلوق میں نافذ اور لاگو کریں۔[135]

پس خالق کی طرف سے پیغمبر دو حیثیتوں سے دنیا میں بھیجے جاتے تھے ایک نبی اور دوسرا خلیفہ ہونے کی۔ پہلی حیثیت میں وہ خالق کے حکم کو اس کی مخلوق تک پہنچانے کے لیے واسطہ ہوتے ہیں جبکہ دوسری حیثیت میں وہ خالق کے حکم کو اس کی مخلوق کے مابین جاری وساری کرتے ہیں اور اللہ کے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نبوت اگرچہ ختم ہو گئی لیکن علم میں وراثت اور قوت میں خلافت جاری ہے۔[136] حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ قرار دیا۔[137] ان کے بعد صحابہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا خلیفہ قرار دیا۔[138] پس خلافت اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے "خلفائے راشدین" (632-661) کو منتقل ہوئی اور یہ دور خلافت، نبوت کے منہاج پر قائم تھا۔[139]

"خلافت راشدہ" سے یہ خلافت بنو امیہ (661-750) کو منتقل ہوئی جبکہ اس میں "ملوکیت" کی بھی آمیزش ہو چکی تھی۔ ملوکیت کی آمیزش کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو امیہ کے حکمرانوں کو خلفاء قرار دیا کیونکہ وہ خلیفہ کے منصب پر فائز تھے۔[140] بنو امیہ (661-750) سے یہ خلافت بنو عباس (750-1517) نے اور ان سے عثمانی ترکوں (1517-1924) نے بزور شمشیر حاصل کی۔[141] 1924ء میں انگریزوں کی سازش کے سبب سے خلافت کا ادارہ ختم کر دیا گیا اور اس وقت سے امت مسلمہ میں اس ادارے کی بحالی کے لیے اسلامی تحریکیں برپا ہونا شروع ہوئیں۔

جس طرح ابتداء میں حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت ارضی میں تمام انسان ایک ہی دین پر تھے، بالکل اسی طرح انتہاء میں حضرت عیسی علیہ السلام کی خلافت ارضی میں تمام انسان ایک ہی دین پر ہوں گے۔[142] بہر حال یہ تو خالق کا "تکوینی امر" ہے جو پورا ہو کر رہنے والا ہے جبکہ "امر شرعی" یہ ہے کہ ابتداء اور انتہاء کے درمیان کی مدت میں خالق کے مومن بندے خالق کے دین کی حفاظت، فروغ اور غلبہ کے لیے دعوت وجہاد کا کام کریں۔[143] اللہ عزوجل اس دنیا میں اپنے بندوں پر "حجت" قائم کرتے ہیں، تاکہ قیامت والے دن ان کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہے۔[144] یہ حجت دو طرح سے قائم ہوتی ہے، ایک رسول کی دعوت سے اور دوسرا خالق کی کتاب سے۔[145] محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ آخری نبی ہیں، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد قیامت تک کے لیے خالق کے بندوں پر خالق کی کتاب کو "حجت" بنایا گیا۔[146]

مشرکین ہوں یا اہل کتاب، دونوں کے بارے اللہ کی کتاب کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ یا تو اسلام قبول کریں یا پھر جزیہ دے کر رہیں۔[147] اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین عرب کے مقابلہ کے لیے جب بھی صحابہ کا کوئی لشکر روانہ کرتے تھے تو انہیں تین چیزوں اسلام، جزیہ یا قتال کی دعوت دینے کی نصیحت فرماتے۔[148] مشرکین اور اہل کتاب کو مفتوح ومغلوب کرنے کی غرض سے "جہاد کا حکم" قیامت تک کے لیے باقی ہے[149] جبکہ ان پر جزیہ عائد کرنے کا حکم نزول مسیح ابن مریم علیہ السلام تک قائم رہے گا۔[150]

جہاد وقتال کی حکمت اسلام میں ایک ہی ہے اور وہ "ظلم وعدوان" ہے۔[151] اور اس کی دلیل نص صریح ہے۔[152] قرآن مجید میں بظاہر جن منضبط اوصاف کی بنیاد پر جہاد وقتال کا حکم دیا گیا ہے وہ دراصل "ظلم وعدوان" ہی کی صورتیں ہیں۔ اسلام "ظلم وعدوان" کی کسی صورت کو کسی طور برداشت نہیں کرتا، چاہے اہل ایمان پر ہو یا خواہ انسانوں پر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ عزوجل نے "ظلم وعدوان" کے خاتمہ کے لیے ظالموں کے خلاف قتال کو مشروع قرار دیا ہے، چاہے وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔[153]

اب اگر سوال یہ ہو کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانے میں مشرکین عرب، یہود عرب، اہل فارس اور اہل روم سے جہاد وقتال کیوں ہوا؟ اور اگر "اتمام حجت" وجہ نہیں تھی[154] تو اس جہاد وقتال کی کیا وجہ تھی؟ تو اس جہاد وقتال کی ایک ہی وجہ ہے اور وہ "ظلم وعدوان" ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے، چاہے یہ ظلم ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر کرے یا خواہ ایک انسان دوسرے انسان پر کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانے میں مشرکین عرب، اہل کتاب اور اہل فارس نے اپنے مذہبی عقائد کی روشنی میں جو ایک ظالمانہ اور استحصالی اجتماعی یا ریاستی نظام قائم کر رکھا تھا، دراصل اس ظالم اور استحصالی

ریاست کے خلاف جہاد و قتال کیا گیا ہے۔[155] پس ایک اسلامی ریاست کی اقوام عالم کے حوالہ سے دو خارجی ذمہ داریاں ہیں: ایک عالم دنیا تک پیغام رسالت کو پہنچانا اور دوسرا عالم دنیا سے ظلم کا خاتمہ۔ پہلی ذمہ داری کے لیے دعوت و تبلیغ کے عمل کو ریاست کی سرپرستی حاصل ہو گی جبکہ دوسری کے لیے جہاد و قتال کو ریاست کی بنیادی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے[156] بشرطیکہ ریاست اس کی اہلیت رکھتی ہو اور خارج میں حالات اس کی اجازت دیتے ہوں۔

4-ایمان اور اخلاق (Belief and Ethics):

اسلام دین فطرت ہے کہ ہر بچہ مسلمان پیدا ہوتا ہے اور اس کے والدین اسے یہودی، عیسائی یا مجوسی وغیرہ بنا دیتے ہیں۔[157] ایمان محض اندھے یقین (blind faith) کا نام نہیں بلکہ ایک تجربہ (experiment) ہے۔

مخلوق کافر اور مومن میں تقسیم ہے۔[158] خالق کی نظر میں کافر اور مومن برابر نہیں ہیں۔[159] اس کی نظر میں کافر بدترین انسان اور مومن بہترین انسان ہیں۔[160] کافر حربی کا حکم قتل،[161] ذمی کا جزیہ،[162] مستامن کا امن[163] اور معاہد کا صلح[164] ہے۔ مومن کے لیے کافر سے تعلق ولایت حرام[165] جبکہ تقیہ،[166] انصاف،[167] حسن سلوک[168] اور معاملہ[169] جائز ہے۔ اسلامی ریاست میں مومن اور کافر کے حقوق برابر نہیں ہیں۔[170]

دین فطرت میں "اسلام" ظاہر، "ایمان" باطن اور "احسان" دونوں کی تکمیل کا نام ہے۔[171] اسلام میں داخل ہونے کے لیے کلمہ شہادت کا اقرار ضروری ہے[172] جبکہ کفر اکبر یا شرک اکبر کے ارتکاب سے ایک شخص دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔[173] کسی کلمہ گو کی "تکفیر" گناہ کبیرہ ہے[174] اور معین کی تکفیر اس وقت جائز ہو گی جبکہ کبار اور عادل اہل علم کی جماعت کا اس پر اتفاق ہو جائے۔[175] "کفر دون کفر" گناہ کبیرہ ہے نہ کہ "خارج عن الملۃ"۔[176] ایک شخص میں اسلام و کفر،[177] ایمان و نفاق[178] اور اطاعت و معصیت جمع ہو سکتے ہیں۔[179]

اور عمل سے ایمان میں کمی بیشی ہو، ناحق ہے۔[180] اور ہم معین شخص کے بارے نہ جنت کی شہادت دے سکتے ہیں اور نہ ہی جہنم کی گواہی۔[181] جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہو گا وہ جنت میں ضرور داخل ہو گا اور جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہو گا وہ جہنم میں ضرور داخل ہو گا۔[182]

اخلاق انسان کی باطنی صورت ہے کہ اچھی ہو تو اسے "حسن خلق" کہتے ہیں۔ افعال کا حسن وقبح عقلی ہے[183] لیکن ان کا خیر وشر ہونا شرعی ہے۔[184] خیر وہ ہے جسے خالق نے خیر قرار دیا ہو اور شر وہ ہے جسے خالق نے شر کہا ہو۔[185]

خالق کے فرمانبردار سے محبت کرنا اور اس کے باغی سے نفرت رکھنا اس پر ایمان کا حق ہے۔[186] لہٰذا دعوت کے اخلاق اور جہاد کے اخلاق میں فرق ہے۔[187] نیکی "حسن اخلاق" پیدا کرتی ہے جبکہ بدی "بدترین اخلاق" کو جنم دیتی ہے۔[188]

بعض اخلاق جبلی ہیں اور اکثر ایمان سے پیدا ہوتے ہیں۔[189] ایمان اور اخلاق کا تعلق لازم وملزوم کا ہے۔[190] حسن اخلاق، کمال ایمان کا نتیجہ ہے۔[191] "حسن اخلاق" کی تکمیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں ہوئی۔[192] لہٰذا بہترین اخلاق وہ ہیں جو "اسوہ حسنہ" کی اتباع سے پیدا ہوتے ہیں۔[193]

□□□□□□□□□□□

حواشی:

---

[1] Islam: A Theory of everything

[2] خدا ناشناس (atheists) مخلوق کے وجود کو مانتے ہیں اور خالق کے انکاری ہیں جبکہ وجودی (panentheists) صرف خالق کا وجود مانتے ہیں اور مخلوق کو خالق کا خیال قرار دیتے ہیں۔ خالق اور مخلوق دونوں کا وجود حقیقت (reality) ہے کیونکہ "صفت خلق" (creation) اور مخلوق (creature) کا تعلق علت ومعلول (cause and effect) کا ہے کہ جس میں ایک کے اقرار سے دوسرے کا انکار ناممکن ہے۔
صفات باری تعالی "ذاتیہ/خبریہ" اور "فعلیہ" میں تقسیم ہیں۔ پہلی کی مثال حیات، علم، ارادہ، قدرت، سماعت، بصارت، کلام، عزت، حکمت، ملک، عظمت، جلال، جمال، کمال، رحمت، علو، ید، عین، وجہ، قدم وغیرہ ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جو مشیئت سے متعلق ہے جیسا کہ استواء، اتیان، مجیء، نزول، خلق، رزق، قبض، بسط، اماتہ، احیاء، احسان اور عدل وغیرہ۔ یہ سب صفات "ازلی" ہیں، صرف اس فرق کے ساتھ کے دوسری قسم "قدیم النوع" اور "حادث الآحاد" ہے۔ یہ تقسیم محض "نقل" کے مطابق ہے۔
جبکہ "عقل ونقل" کے امتزاج سے ایک اور تقسیم کے مطابق صفات کی چار اقسام ہیں: "معانی"، "معنویہ"، "سلبیہ" اور "نفسیہ"۔ پہلی قسم میں حیات، علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر، کلام اور تکوین جبکہ دوسری میں حی، علیم، قدیر، مرید، سمیع، بصیر اور کلیم شامل ہیں۔ تیسری میں قدم، بقاء، مخالفت حدوث، وحدانیت اور قیام بالنفس جبکہ چوتھی میں صفت وجود شامل ہے۔

[3] منکرین خدا (atheists) کے پاس خدا کے انکار کی جو سائنسی دلیل ہے وہ دو علوم، فزکس اور بیالوجی، سے پیدا کی گئی

ہے۔ "نظریاتی فزکس" میں کائنات کی ابتداء کو متعین کرنے کے لیے بگ بینگ (Big Bang) کا نظریہ پیش کیا گیا جبکہ "نظریاتی بیالوجی" میں انسان کی ابتداء کو جاننے کے لیے ارتقاء کا نظریہ (Theory of Evolution) سامنے آیا۔ یہاں ہم نہ صرف دونوں قسم کے نظریات کا ایک تجزیہ پیش کریں گے بلکہ متبادل نظریہ تخلیق (Creationism) کا بھی ذکر کریں گے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ منکرین خدا نے فزکس میں بگ بینگ اور بیالوجی میں ارتقاء کے نظریات پر کمال ایمان کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی سیاسی پارٹی کے جیالوں کے سے رویے کے ساتھ اہل مذہب کے خلاف ایک فکری جنگ (intellectual war) کا آغاز کر دیا ہے۔ اہل سائنس اور اہل مذہب دونوں بالترتیب سائنس اور مذہب پر نہ صرف اندھا ایمان (blind faith) لاتے ہیں بلکہ اس کے پرجوش مبلغ بھی ہیں۔ اور دونوں ہی ایمان اور جذبات کی بنیاد پر آپس میں مکالمہ (dialogue) کر رہے ہیں۔ ایک کا پیغمبر پر ایمان ہے جبکہ دوسرے کا سائنسدان پر۔

فزکس میں بیگ بینگ کا نظریہ "کائنات کی ابتداء کیسے ہوئی ؟"[How] کا تو جواب دیتا ہے لیکن "کیوں ہوئی؟" [Why] کو واضح نہیں کرتا۔ بعض سائنسدانوں کا خیال ہے کہ انہوں نے ایم – تھیوری (M-Theory) کی صورت میں ایک ایسا نظریہ بیان کر دیا ہے کہ جس نے کائنات کے وجود کے بارے بنیادی سوالات کا جواب دے دیا ہے اور وہ اسے "A Theory of Everything" کا نام دیتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ وہ ایک ریاضیاتی مساوات (mathematical equation) کے ساتھ اس کائنات کی ہر شیء کی تشریح کر سکتے ہیں۔ ہماری نظر میں یہ ممکن ہے کہ ہم ایک ہی مساوات (equation) کے ساتھ ساری کائنات کی تشریح کر سکیں لیکن وہ مساوات "خالق اور مخلوق کا باہمی تعلق" کی مساوات ہے۔

فزکس کی "A Theory of Everything" نے عمدہ سوالات توخوبصورت طریقے سے اٹھا دیے لیکن ساتھ ہی اس سوال کو غیر متعلق قرار دیا ہے کہ بگ بینگ سے پہلے کیا تھا؟ یا قوانین فطرت کا مبدا (origin of laws of nature) کیا ہے؟ وہ اس بارے کچھ بات کرنے کو تیار ہی نہیں سوائے اس انفارمیشن کے کہ گلیگلیو (Galileo)، کاپرنیکس (Copernicus) اور نیوٹن (Newton) ان قوانین کو خدا کا کام (Work of God) مانتے تھے۔ یہ سب سائنسدان توخدا (personal God) پر ایمان رکھتے ہی ہیں بلکہ ان کے علاوہ آئن اسٹائن (Einstein)، آرتھر کامٹن (Arthur Compton)، پاسکل (Blaise Pascal)، ارنسٹ ہیکل (Ernst Haeckel) ، جیمز میکس ویل (James Maxwell)، ڈیکارٹ (Rene Descartes)، بیکن (Francis Bacon)، کیپلر (Johannes Kepler)، لوئیس پاسچر (Louis Pasteur)، گریگر (Gregor Mendel)، گاٹ فریڈ (Gottfried Leibniz)، مارکونی (Guglielmo Marconi)، میکس پلانکس (Max Planck)، تھامسن کیلون (Thomson Kelvin)، ہیزنبرگ (Werner Heisenberg)، ایرون شیلڈ یز (Erwin Schrodinger)، فرانسس کولنز (Francis Collins)، جان ایکلز (John Eccles) وغیرہ بھی خدا کے وجود پر ایمان اور یقین رکھتے ہیں لیکن عصر حاضر میں جو تھیوری بھی اپنے بارے میں "A Theory of Everything" ہونے کا دعوی کرے

گی تو اسے تو ان سارے سوالات کا جواب دینا پڑے گا۔

چلیں! اگر بفرض محال ہم اس نظریے پر ایمان لے آئیں کہ قوانین فطرت (laws of nature) نے کائنات کو پیدا کیا ہے تو اگلا سوال یہ پیدا ہوا کہ قوانین فطرت کا مبدا (origin) کیا ہے؟ یا ہم اس کو مان لیں کہ اس کائنات کی ابتدا بگ بینگ (Big Bang) سے ہوئی ہے تو اگلا سوال یہ پیدا ہوا کہ اس سے پہلے کیا ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے جب تک آپ کا نظریہ ان بنیادی سوالات کی وضاحت نہیں کرتا اس وقت تک یہ نامکمل اور ناقص ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بگ بینگ وغیرہ ابھی نظریہ (theory) ہے نہ کہ مشاہدہ (observation) یا تجربہ (experiment) اور کسی سائنسی نظریہ پر ایمان لانا، کسی مذہبی نقطہ نظر پر ایمان لانے سے کس طرح مختلف ہو سکتا ہے؟ کیا دونوں "blind faith" نہیں ہیں؟ تیسری بات یہ ہے کہ اگر کائنات کی ابتدا کے بارے کوئی سائنسی نظریہ مشاہدہ یا تجربہ (observation or experiment) سے ثابت ہو بھی جائے تو دنیا میں کتنے لوگ ہیں جو سائنسی مشاہدے یا تجربات کو متعلقہ علوم کی اصطلاحی زبان میں (in terms of concerned sciences) سمجھنے کی صلاحیت اور اہلیت رکھتے ہیں؟ "ایم – تھیوری" سے اگر آپ کائنات کی تشریح کر دیں تو اس تھیوری کو دنیا میں سمجھنے والے کتنے لوگ ہوں گے؟ اپنی اہلیت اور تعلیم دونوں پہلوؤں سے؟ "ایم - تھیوری"، ماہرین فزکس کی سمجھ میں جتنی آئے سو آئے، بقیہ دنیا کے لیے یہ سائنس نہیں بلکہ سائنسدانوں پر ایمان بالغیب کا سوال ہی رہے گا۔ چوتھی بات یہ ہے کہ ابھی تو بگ بینگ پر تحقیقات سامنے آ رہی ہیں اور کچھ سائنسدانوں نے اسے چیلنج کرنا شروع کر دیا ہے جیسا کہ حال ہی میں جرمن یونیورسٹی ہائیڈل برگ (Heidelberg University) کے ایک نظریاتی ماہر طبیعیات (theoretical physicist) نے "A Universe without Expansion, 2013" کے نام سے ایک ریسرچ آرٹیکل پیش کیا ہے۔

بگ بینگ (Bif Bang)، ارتقاء (Theory of Evolution)، بلیک ہولز (Black Holes) اور کثیر کائناتی (Multiverse) نظریات اس سے زیادہ ایمان بالغیب کے متقاضی ہیں کہ جتنا "کتاب مقدس" اپنے ماننے والوں سے کرتی ہے۔ ایک دہریے نے مسلمان سے کہا: کیا آپ نے دی گرینڈ ڈیزائن "The Grand Design" پڑھی ہے؟ مسلمان نے کہا: کیا آپ نے دی گرینڈ پلان "The Grand Plan" پڑھی ہے؟ دہریے نے کہا: نہیں! ویسے یہ کتاب کس کی ہے؟ مسلمان نے کہا: دی گرینڈ ڈیزائن میں تو صرف ڈیزائن کا ذکر ہے، ڈیزائنر غائب ہے جبکہ دی گرینڈ پلان میں گرینڈ ڈیزائن کے ساتھ ڈیزائنر کا بھی ذکر ہے۔ دہریہ کہنے لگا: واہ، کمال کی بات ہے۔ لیکن پھر بھی بتاؤ تو سہی کہ لکھی کس نے ہے؟ مسلمان نے کہا: خود ڈیزائنر نے۔

اس مکالمہ میں "دی گرینڈ پلان" سے مراد "لوح محفوظ" ہے کہ جس میں کائنات کا ماضی، حال اور مستقبل سب کچھ لکھا ہوا ہے۔ "دی گرینڈ ڈیزائن" تو کسی کو دیکھنا شاید ہی نصیب ہو لیکن "دی گرینڈ پلان" کا مشاہدہ (observation) اور تجربہ (experience) تو ہم روزانہ آفاق وانفس (Horizons of the Universe and own selves) میں کرتے ہیں۔ سائنسدان اس "پلان" کے انسانی ذات اور کائنات دونوں پر واقع ہونے کے سامنے کس قدر بے بس، محتاج، عاجز اور مسکین ہے؟ قوانین قدرت (laws of nature) کو دریافت اور تسخیر کر لینے کے بعد بھی

نہ اس دنیا میں آنے میں انسان کی مرضی غالب ہے اور نہ جانے میں اس کی خواہش کا احترام ہے اور نہ ہی آنے جانے کے درمیانی وقت میں کسی خوشی کا حصول یا تکلیف سے نجات میں اس کا ارادہ (will) غالب ہے۔ ڈیزائن عظیم ہے تو ڈیزائنر بھی عظیم ہو گا اور نہ صرف عظیم ہو گا بلکہ اپنی مرضی (will) کو غالب رکھے گا۔

اب کیا اشرف المخلوقات اس قدر گر جائے گا کہ سمیع و بصیر وحدہ لاشریک کے مقابلے میں اندھے بہرے مادی قوانین فطرت کے نہ صرف خالق اور مدبر (creator and organizer) بلکہ رازق (sustainer) اور قدیر (powerful to will anything) ہونے پر بھی ایمان لے آئے گا؟ اتنی سیدھی سی بات ہے لیکن اس کو سمجھ نہیں آسکتی کہ جس پر اپنی "سمجھ" دہریوں کے پاس رہن رکھوانے کا طعن لگ جائے۔ [الطور: 35]

We will describe how M-theory may offer answers to the question of creation. According to M-theory, ours is not the only universe. Instead, M-theory predicts that a great many universes were created out of nothing. Their creation does not require the intervention of some supernatural being or god. Rather, these multiple universes arise naturally from physical law. [Stephen W. Hawking and Leonard Mlodinow, (Bantam Books: New York, 2010), p. 14]; Bodies such as stars or black holes cannot just appear out of nothing. But a whole universe can...Because there is a law like gravity, the universe can and will create itself from nothing...It is not necessary to invoke God to light the blue touch paper and set the universe going. [Stephen W. Hawking and Leonard Mlodinow, p. 144]

قوانین فطرت کائنات کو پیدا کر سکتے ہیں لیکن ایک جیٹ انجن نہیں بنا سکتے؟ دہریوں کی یہ عجیب تر منطق ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ "عدم" (nothing) سے "عدم" (nothing) ہی نکل سکتا ہے نہ کہ "کچھ" (something)۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہم یہ کہیں کہ "X" نے "Y" کو بنایا ہے تو "X" پہلے ہو گا اور "Y" بعد میں۔ اور اگر ہم یہ دعوی کریں کہ "X" نے "X" کو پیدا کیا ہے تو "X" اپنی پیدائش (creation) سے پہلے موجود ہو گا اور یہ عدم (nothing) سے پیدا نہیں ہوا۔ تیسری بات یہ ہے کہ جب کائنات کے عدم سے وجود میں آنے کے لیے "قانون کشش ثقل" (law of gravity) کا ہونا ضروری ہے تو یہ عدم سے تو وجود میں نہیں آئی۔ امر واقعہ یہ ہے، جبکہ بہت سے ماہرین فزکس نے بھی اس کا اقرار کیا ہے، کہ الہیات (theology) فزکس کا میدان نہیں تھا لیکن بعض نامور سائنسدانوں نے نظریاتی فزکس (theoretical physics) کے رستے اس میں گھس کر اپنی تحریروں میں سطحیت پیدا کر لی ہے۔ پس قوانین فطرت بیانیہ (descriptive) اور خبریہ (predictive) ہو سکتے ہیں لیکن خالق

(creator) نہیں۔
[هود: 24]؛ [الرعد: 16]؛ [فاطر: 19-25]؛ [غافر: 56]

اور فزکس میں خود (quantum mechanics) اور (general relativity) کے میدانوں (disciplines) کے باہمی اختلاف نے فزکس کے رستے حقیقت (reality) تک رسائی کو تقریباً ناممکن بنادیا ہے۔ پہلی شاخ کی بنیاد electromagnetic، strong nuclear اور weak nuclear قوتوں پر ہے جبکہ دوسری میں اصل کشش ثقل (gravity) ہے۔ اور اس موضوع پر مطالعہ یہ بتلاتا ہے کہ "quantum gravity" کے رستے اسٹرنگ تھیوری (string theory) وغیرہ جیسی کوششوں سے انہیں جمع کرنا تا حال ایک خواہش سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ علاوہ ازیں کوانٹم میکانکس میں اصول لایقینیت (uncertainty principle) اور موج وذرہ دوگانگی (wave-particle duality) نے تو اس مقدمے کو کچھ اور یقینی بنادیا ہے کہ فزکس کے رستے حقیقت (reality) تک رسائی ناممکن ہے۔ اگر بگ بینگ کو مان بھی لیا جائے تو بھی ڈیزائن کی دلیل (Design Argument) اس بات کی متقاضی ہے کہ خالق کو مانا جائے۔ مثلاً کیا وجہ ہے کہ بگ بینگ میں توسیع کائنات کا تناسب (rate of expansion of the universe) اتنا ہی کیوں ہے کہ جو زندگی کے لیے معاون (supporting for life) ہو؟ اسی طرح اس تھیوری میں سینکڑوں مقامات پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے اور ہر جگہ اس کا جواب اتفاق (chance) سے دینا ناممکن بلکہ نظریہ احتمال (probability theory) کے بھی خلاف ہے۔ اس "اتفاق" کے اعتراض کا جواب دینے کے لیے دہریوں کی طرف سے "کثیر کائناتی" (Multiverse) کا نظریہ پیش کیا گیا ہے اور ہمارے سادہ لوح مسلمان سائنسدان اس نظریے کو قرآن مجید سے ثابت کرنے کی کوششیں فرمارہے ہیں۔ معلوم نہیں ہمیں کیا ہوگیا ہے؟ کیا ہم مغرب کے جملہ سائنسی اوہام (superstitions) کو قرآن مجید سے ثابت کر ہی کتاب اللہ اور سائنسی نظریہ دونوں کی حقانیت (authenticity) ثابت کرسکتے ہیں؟

اور اب تو "متوازی کائنات" (parallel universe)، "مخالف زمین" (counter earth)، اور "تاریک توانائی" (dark energy) وغیرہ جیسی ابحاث کا مطالعہ کرنے سے یہ "سائنس" کم اور "افسانہ" (fiction) زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اور اللہ نہ کرے کہ ہمارے ہاں کسی مخلص مسلمان سائنسدان کو یہ خیال سوجھے کہ وہ اس "افسانوی سائنس" (theoratical physics) سے "عالم مثال" کا وجود ثابت کرنے کی کوشش کرے۔

اور خدا کے وجود کے بہت سے دلائل ہیں کہ جو اس وقت ہمارا موضوع نہیں ہیں۔ مثال کے طور مذہبی تجربہ (religious experiment) اس کے وجود کی ایک صریح دلیل ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ذکر ہے۔ [النور: 35] اور ایمان محض اندھے یقین (blind faith) کا نام نہیں بلکہ ایک تجربہ (experiment) بھی ہے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: [البخاري، أبو عبد الله محمد بن إسماعيل، الجامع المسند الصحيح المختصر من أمور رسول الله صلى الله عليه وسلم وسننه وأيامه = صحيح البخاري، كِتَابُ الإِيمَانِ، بَابٌ مَنْ كَرِهَ أَنْ يَعُودَ فِي الكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُلْقَى فِي النَّارِ مِنَ الإِيمَانِ، دار طوق النجاة، الأولى، 1422هـ، 13/1]

اسی طرح دنیا میں لاکھوں انسانوں کو اس کا تجربہ ہوتا ہے کہ وہ وہ کسی مشکل گھڑی میں اپنے رب کو پکارتے ہیں تو ان کی مصیبت دور ہو جاتی ہے اور اکثر اوقات تو دنیاوی علوم کے مطابق آزمائش کے ٹل جانے یا دعا کے پورا ہو جانے کی سوائے "خدا کی مدد" (Intevention of God) کے اور کوئی توجیح ممکن نہیں ہوتی مثلاً کینسر کے آخری مرحلے کے مریض دعا کے نتیجے میں صحت یاب ہو جاتے ہیں۔

شیخ بن باز رحمہ اللہ کے پاس ایک دہریہ (atheist) آیا اور ان سے کافی دیر تک خدا کے وجود کے بارے سوالات کرتا رہا اور شیخ اس کے سوالات کے جوابات دیتے رہے یہاں تک کہ اس نے تنگ آکر کہا: کیا آپ کو کبھی خدا کے وجود کے بارے شک نہیں ہوا؟ شیخ نے کہا: نہیں، اور یہ تمہاری بد بختی ہے کہ تمہیں خدا کے وجود کے بارے شک پیدا ہوا ہے۔ [إبراهيم: 10]

شیخ کے اس جواب میں کوئی بناوٹ یا مصنوعیت نہیں تھی۔ آپ آج بھی پاکستان کے کسی بھی گاؤں کی مسجد میں پنج وقتہ نمازی ان پڑھ بوڑھے باباجی سے سوال کر لیں کہ انہیں اپنی زندگی میں کبھی خدا کے نہ ہونے کے بارے سوال پیدا ہوا تو جواب نفی میں ہو گا۔ دنیا میں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں لوگ ہیں جنہیں زندگی بھر میں نہ تو کبھی شک ہوا اور نہ ہی کوئی سوال پیدا ہوا۔ یہ کیا ہے؟ یہ ایمان کا تجربہ ہے جو ہر "مخلص" بندہ مومن کو حاصل ہوتا ہے جبکہ "مداری" اس سے محروم رہتا ہے۔

علاوہ ازیں خالق کے وجود پر اس کی مخلوق ہی دلالت کرنے کے لیے کافی ہے جیسا کہ فن پارے کا وجود فنکار (artist)، عالیشان عمارت کا وجود اپنے معمار اور جیٹ انجن کا وجود اپنے انجینئر کے حسن تخلیق کی دلیل ہے۔[العنكبوت: 20]؛ [الذاريات: 20-21]؛ [فصلت: 53]؛ [إيثار الحق على الخلق في رد الخلافات إلى المذهب الحق من أصول التوحيد، ابن الوزير، محمد بن إبراهيم بن علي بن المرتضى الحسني القاسمي، دار الكتب العلمية – بيروت، الثانية، 1987م، 52]

رہی بیالوجی کی بات تو زمین پر حیات کی ابتدا (Origin of Life on Earth) سے ہٹ کر کائنات کے مبدا (Origin of the Universe) کے بارے کچھ پیشین گوئی (predict) اس کے بس سے باہر ہے کیونکہ یہ اس کا موضوع اور میدان ہی نہیں ہے۔ تو یہ نظریہ بھی نامکمل اور ناقص ہے اور اس قابل نہیں ہے کہ "A Theory of Everything" بن سکے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نظریہ ارتقاء کو مان لینے کا لازمی نتیجہ خدا کا انکار (atheism) نہیں ہے۔ "نظریہ تخلیق" (creationism) نے جو مکاتب فکر (schools of thought) پیدا کیے ہیں ان میں "Theistic Evolution" اور "Intelligent Design" نے ارتقاء کو خدا کے وجود کی دلیل کے طور بیان کیا ہے۔ امریکن ماہر جینیات (geneticist) ڈائریکٹر این آئی ایچ (NIH) کی کتاب "The Language of God: A Scientist Presents Evidence for Belief" اسی سلسلے کی کوشش ہے۔ پھر ارتقاء ایک نظریہ (theory) ہے یا امر واقعہ (fact)، اس بارے ماہرین حیاتیات (biologists) کا اختلاف ہے۔ ڈاکنز (Dawkinz) کے نزدیک یہ ایک امر واقعہ (fact) ہے، فٹشیو (Kirk Fitzhugh) نے اسے نظریہ (theory)

کہا ہے۔ اور جولین ہکسلے (Julian Huxley)، رچرڈ لینسکی (Richard Lenski) وغیرہ کا کہنا ہے کہ یہ کچھ نظریہ (theory) ہے اور کچھ امر واقعہ (fact)۔ اور جسے امر واقعہ کہا جا سکتا ہے وہ وقت کے ساتھ حیاتیات میں تبدیلی (change in organism during the history) ہے جبکہ اس کے علاوہ ابھی نظریہ ہے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ نظریہ ارتقاء کو امر واقعہ (fact) ماننے کا جواب "Irreducible Complexity" کے نظریہ میں مکمل طور موجود ہے۔ اس کا جواب بعض لوگوں نے "The Blindwatchmaker" سے دینے کی کوشش کی ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ دہریے سنتے دیکھنے خالق کا انکار کرتے کرتے اندھے بہرے خدا کا اقرار کر بیٹھے۔ عصر حاضر کے دہریوں نے خدا کے انکار کے نتیجے میں جو "جہالت" پیدا کر دی ہے، اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ یا تو آپ ارتقاء پر ایمان لاتے ہوئے فطری انتخاب "Natural Selection" کو اندھے بہرے خدا کے طور پر مان لیں یا پھر بگ بینگ پر ایمان رکھتے ہوئے خدائی ذرے "God Particle" کی کھوج کی صورت میں اندھے بہرے خدا کی تلاش کی مہم جاری رکھیں۔ اور پانچویں بات یہ ہے کہ اگر ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو بفرض محال امر واقعہ (fact) مان بھی لیا جائے تو پھر بھی ایک عام شخص کے لیے یہ ماہرین حیاتیات (biologists) پر اندھا ایمان (blind faith) لانے کا سوال ہی بنتا ہے کیونکہ عامی کے پاس نہ تو اس نظریے کے جمیع پیچیدہ اور تفصیلی مراحل کو سمجھنے کی صلاحیت ہے اور نہ ہی اتنا علم کہ ان کا تنقیدی یا تجزیاتی جائزہ (critical and analytic study) لے سکے۔ چھٹی بات یہ ہے کہ ڈین این اے میں تبدیلی (change in DNA) ارتقاء کے حق میں جتنی دلیل بنتی ہے، اس سے زیادہ اس کے خلاف دلیل بنتی ہے۔ رینگنے والے جانوروں (reptiles) کے ڈی این اے (DNA) میں پرندوں کے پروں کے بارے کوئی معلومات (information) نہیں ہوتی تو یہ اضافی انفارمیشن (additional information) کہاں سے آ گئی؟ امر واقعہ یہ ہے کہ جنیاتی تبدیلی (genetic mutation) سے جنیاتی انفارمیشن (genetic information) پیدا نہیں ہوتی بلکہ کم ہی ہوتی ہے۔ اور اضافی انفارمیشن کے لیے "intellect" کا ہونا ضروری ہے۔

آج کل کچھ مسلم بیالوجسٹ ارتقاء کے حق میں یہ دلیل دیتے نظر آتے ہیں کہ قرآن مجید میں بھی تو بچے کی پیدائش کے مراحل بیان ہوئے ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ بچے کی پیدائش کے مراحل میں جو تبدیلی ہے، وہ ایک ہی نوع (species) کے متنوع مراحل ہیں جبکہ ارتقاء پسند تو "چھچھوندر" سے "انسان" بننے کی بات کر رہے ہیں۔ اسی طرح "مالٹے" اور "کنو" سے "سنگترہ" بنانے یا ان سے "ناریل" اور "تربوز" بنانے یا "آم" اور "کیلا" بنانے میں کیا کوئی فرق نہیں ہے؟ "کتے" کی ایک نسل سے دوسری نسل کے پیدا ہو جانے کے امکان اور "کتے" سے "بلی" بن جانے کے امکان میں کیا کوئی فرق نہیں ہے؟ "ارتقائی درخت" (evolutionary tree) اسی قسم کے لطیفوں سے بھرا پڑا ہے کہ جس کے مطابق "کتا" اور "ریچھ" آپس میں چچازاد (cousin) ہیں لیکن دلیل اس کی "غائب ربط" (missing link) ہے۔ اور اب تو علمی دیانتداری اور ارتقائی مذہب پر ایمان کا یہ عالم ہے کہ بیالوجسٹ "بندر" (apes) اور "انسان" کے مابین "غائب ربط" (missing link) تلاش کرنے کی بجائے اسے "بنانے" کی خدمت سر انجام دے رہے ہیں۔

رہے پاکستانی دہریے (Pakistani Atheists) تو ان سے بات چیت اور انہیں پڑھنے سننے کے بعد ایک شخص کا احساس یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی مذاق (joke) سے کم نہیں ہیں۔ ان میں کچھ تو نواجون ہیں جو اپنے دہریے (atheist) ہونے پر بڑا فخر کرتے ہیں اور ان کی زندگی کا کل مقصود یہ ہے کہ انہیں اپنے خیالات جیسی کوئی لڑکی (female atheist) مل جائے اور اس کے بعد کی کہانی واضح ہے۔ ان میں بعض وہ بھی ہیں جو بات بات پر ان شاء اللہ یا thank "God" کہیں گے یا عید کی نماز پڑھ لیں گے یا کسی کی نماز جنازہ میں شریک ہو جائیں گے۔ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس نے مرنے سے پہلے اپنے ورثا کو یہ وصیت کی ہو کہ میرا جنازہ نہ پڑھانا یا جو اپنی ماں، بیٹی یا بہن سے نکاح کو جائز سمجھتا ہو۔ ان میں بعض وہ ہیں جو اپنے آپ کو مفکر (intellectual) ثابت کرنے لیے ایسی حرکتیں کرتے ہیں جبکہ بعض وہ ہیں جو مولوی کا ردعمل (reaction) ہیں۔ اور اگر زیادہ کسی نے علمی میدان میں کوئی تیر مار لیا تو کسی انگریز دہریے کی کتاب کا اردو ترجمہ کر دیا اور اس فخر کے ساتھ جیسے اندھیروں میں علم کی "مشعل" روشن کر دی ہو۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اگر اصل کتاب اگر فنی ہو تو اردو ترجمے سے زیادہ انگریزی میں کتاب زیادہ سمجھ آتی ہے۔ ان سب رویوں کے بارے ہمارے پاس پریشان خیال دہریہ "confused atheist" کی ایک اصطلاح موجود ہے۔

بعض ماہرین حیاتیات (biologist) کا کہنا ہے کہ ڈارون نے یہ ممکن بنا دیا ہے کہ ہم ایک مسلح فکری دہریے (intellectual fulfilled atheist) کی طرح زندگی گزار سکیں جبکہ دوسری طرف ہمارے بعض مسلم بیالوجسٹ قرآن مجید سے ارتقاء کو ثابت کرنے کی مذہبی خدمت سرانجام دینے میں مصروف عمل ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ڈارون سے پہلے ان دہریوں (Atheists) کے پاس تخلیق کائنات اور انسان کی ابتداء کی کوئی توجیہ موجود نہ تھی اور مذہب اور خدا کا انکار کرنے کے بعد اہل مذہب کی طرف سے متبادل کے سوال پر یہ بغلیں جھانکنا شروع کر دیتے تھے۔ ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے تو گویا ان کی چاندی لگا دی ہے، اور اب ان کے پاس خدا اور مذہب کے انکار کے بعد اس کائنات کے موجود ہونے کی کوئی واحد کمزور، نامکمل، گھسی پٹی، غیر منطقی، غیر سائنسی توجیہ اگر موجود ہے تو وہ ڈارون کا نظریہ ارتقاء ہے۔ اور ڈارون کے نظریہ ارتقاء کا گر جانا دہریت کی عمارت دھڑام سے گرنے کے مترادف ہے۔

"Darwin made it possible to be an intellectually fulfilled atheist." [The Blind Watchmaker, (New York: Norton, 1986), pp. 6-7.]

مسلم معاشروں کی ایک انتہا تو اس قسم کے "جیالے دہریے" (Pro Active Atheists) ہیں جن کا ذکر اوپر گزر چکا جبکہ دوسری طرف "مذہبی جیالے" ہیں جو ان دہریوں کے ردعمل میں پیدا ہوئے ہیں یا یہ دونوں انتہائیں ایک دوسرے کا ردعمل ہیں۔ ہم میں بعض لوگ بگ بینگ کی تھیوری کو قرآن مجید سے ثابت کرتے ہیں اور بعض ڈارون کا نظریہ ارتقاء، اور اس طرح ثابت کرتے ہیں جیسے بنیادی ایمانیات (fundamental beliefs) قرآن مجید سے ثابت ہو رہے ہوں۔ اب یہ "مذہبی جیالے پن" کا ہی یہ نتیجہ ہو سکتا ہے کہ کافی عرصہ پہلے پاکستان کی ایک معروف یونیورسٹی کے فزکس ڈیپارٹمنٹ سے متعلق پروفیسرز کے ایک گروپ نے ایک ایسے پراجیکٹ پر کام شروع کیا کہ جس کا مقصد

جنات سے انرجی پیدا کرنا تھا تاکہ پاکستان میں انرجی کا بحران (enery crises) کم کیا جا سکے، اللہ اکبر!۔اس منہج کے مطابق لکھی گئی بعض تفاسیر کا مطالعہ کریں تو قرآن مجید کتاب ہدایت (Book of Guidance) کم اور سائنس کی کتاب (Book of Science) زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ گویا کہ اب قرآن مجید کی حقانیت اس وقت تک ثابت نہیں ہو گی جب تک کہ وہ مغرب کے جملہ اوہام اور منگھڑت نظریات کی کسوٹی پر پورا نہ اترے۔

آج سے تقریباً چالیس سال پہلے ایک سائنسدان نے بلیک ہولز کا نظریہ پیش کیا اور اس کے بعد سے بعض مسلمان سائنسدانوں نے قرآن مجید کی سورۃ الواقعہ کی بعض آیات سے بلیک ہولز کو ثابت کرنا شروع کر دیا۔اب 2014ء میں وہ صاحب تو اپنی تھیوری سے رجوع کر رہے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ میں نے چالیس سال پہلے غلط سمجھا تھا کہ بلیک ہولز سے کسی قسم کی انفارمیشن نہیں نکل سکتی اور جو نکلتی ہے وہ نئی ہوتی ہے۔اور اب وہ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ضروری نہیں ہے کہ بلیک ہولز ہر چیز کو اپنے اندر جذب کر لیں اور یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ہمیں "event horizons" کی بجائے "apparent horizons" پر سوچنا چاہیے کیونکہ کوانٹم میکانکس بھی پہلی صورت کو قبول نہیں کرتی ہے کہ جس میں انفارمیشن ختم ہو جاتی ہے۔

ہماری نظر میں یہ رویہ بالکل بھی درست نہیں ہے بلکہ نقصان دہ ہیں کیونکہ آج ہم اگر نظریہ ارتقاء اور بگ بینگ تھیوری کو قرآن مجید سے ثابت کر کے مسلمانوں سے اس پر ایمان لانے کا مطالبہ کریں گے تو کل کلاں اہل سائنس نے ہی اگر ان نظریات سے رجوع کر لیا تو پھر امت سے کیا کہیں گے؟ کہ خدا غلط تھا؟ سائنس میں نظریہ (theory) اور چیز ہے جبکہ امر واقعہ (fact) بالکل اور شیء ہے۔اسی طرح کسی شیء کے سائنسی امر واقعہ (scientific fact) ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ قرآن مجید بھی اسے لازماً ہی بیان کرے۔ قرآن مجید کا موضوع فزکس، بیالوجی، کیمسٹری، ریاضی نہیں بلکہ ہدایت کا بیان ہے۔البتہ یہ بات درست ہے کہ کتاب اللہ میں بعض ایسی باتیں موجود ہیں کہ جو دیگر علوم کا بھی موضوع ہے لیکن ان میں بھی پروردگار کا اصل مقصود ہدایت کا پہلو ہے جیسا کہ سابقہ قوموں کے حالات وواقعات نقل کیے گئے ہیں یا ماں کے پیٹ میں بچے کی پیدائش کے مراحل بیان کیے گئے ہیں وغیرہ۔

قرآن مجید کے بیان میں کچھ باتیں محکمات میں سے ہیں جبکہ کچھ متشابہات ہیں۔ کچھ آیات کا مفہوم صریح (explicit) ہے جبکہ کچھ میں ایک سے زائد آراء کی گنجائش ہے۔ بچے کی پیدائش کے جو مراحل قرآن مجید نے بیان کیے ہیں، وہ صریح ہیں۔انہیں بیان کرنے یا ان کو سائنسی امر واقعہ کے ساتھ ملا کر بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

قرآن مجید صحابہ کی زبان میں نازل ہوا اور پروردگار نے ان سے ایسا کلام کیا ہے جو ان کو سمجھ آئے۔ یہ تو کلام الٰہی کا نقص شمار ہو گا کہ وہ نہ تو مخاطبین اولین کو سمجھ آیا کہ جنہیں سمجھانے ہی کے لیے وہ نازل کیا گیا تھا اور مزید یہ کہ خدا کا کلام سمجھنے کے لیے ہمیں چودہ صدیاں انتظار بھی کرنا پڑا۔ قرآن مجید کا وہی مفہوم درست ہے جو صحابہ رضوان اللہ علیہم نے سمجھا اور سمجھایا۔[یوسف: 2]

4 بعض ماہرین طبیعیات تو اس بات کو دبا ہی گئے کہ "عدم" (nothing) سے اگر کائنات خود وجود میں آ سکتی ہے تو ان کی "عدم" سے مراد کیا ہے جبکہ بعض نے "عدم" سے "quantum vacuum" مراد لیا ہے اور اس پر کافی بحث ہے کہ

اب عامۃ الناس کو دھوکا دینے کے لیے الفاظ کے معانی بھی اپنے ہی مراد لیے جائیں گے۔
اہل مغرب نے اپنے ہر علم، خواہ وہ سائنسی ہو سماجی، تاریخی ہو یا لسانی، کو نظریہ ارتقاء کی روشنی میں مرتب کر کے دکھادیا ہے اور اہل مشرق کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ہر علم کو، چاہے وہ تاریخ ہو سائنس، نظریہ تخلیق کی روشنی میں مرتب کر کے دکھا دیں۔ اور جب تک ہمارے محققین فلسفہ، سائیکالوجی، بیالوجی، نظریاتی فزکس، عمرانیات، لسانیات اور تاریخ کے مضامین میں نظریہ تخلیق کی روشنی میں بحث و تحقیق کی بنیاد نہیں رکھ دیتے، اس وقت تک دنیاوی علوم سے مذہب کا مقدمہ ثابت کرنا ممکن نہیں ہے۔

[5] تنزلات ستہ مراد ہیں کہ جس کی کوئی دلیل نص میں صراحتاً تو کجا اشارتاً بھی موجود نہیں ہے۔ اس فلسفہ کے مطابق خالق کے وجود سے مخلوق کے وجود تک کا سفر چھ تنزلات [وحدت/حقیقت محمدیہ، وحدیت/اعیان ثابتہ، روح/عالم امر، مثال/عالم کلی، جسم/عالم خلق، انسان/عالم انسان] میں طے ہوا۔ بعض کے نزدیک "احدیت" پہلا تنزل ہے اور وہ "انسان" کو شامل نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ "حقیقت" اپنی ذات اور جوہر کے اعتبار سے "واحد" جبکہ اسماء اور صفات کے اعتبار سے "کثرت" ہے کہ "اعیان ثابتہ" نے وجود کی بو بھی نہیں چکھی۔ "وجود مطلق" اور "عدم مطلق" کے مابین حد فاصل "عالم برزخ" ہے۔ "اسماء وصفات" سے "عدم" میں "اعیان ثابتہ" پر تجلی سے "حقائق ممکنات" کا ظہور ہوا۔ اور عالم متجلی "عالم غیب"، "عالم خیال" اور "عالم شہادۃ" میں منقسم ہے۔ "وجود" سے ان کی مراد "مابہ الموجودیۃ" ہے نہ کہ "مصدری معنی" کہ جو محض ذہنی انتزاع ہے۔
پہلی بات تو یہ ہے کہ "فلاسفہ" کے نزدیک وہ "وجود مطلق بشرط الاطلاق" ہے جبکہ "ان" کے نزدیک "وجود مطلق لابشرط" ہے۔ پہلی صورت میں خالق کا وجود محض "ذہنی" ہے کہ خارج میں "مطلق" کا وجود ممکن نہیں ہے بلکہ "معین" ہی ہوگا جبکہ دوسری صورت میں مخلوق بھی خالق ہی ہے کہ یہ "مجرد وجود" ہے کہ جس میں واجب، ممکن، قدیم، حادث، واحد، کثیر، ذہنی، خارجی، عالم، جاہل، قادر، عاجز وغیرہ کی کوئی قید نہیں ہے۔
دوسری بات یہ ہے کہ ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ "معدومات" کے "اعیان" عدم میں "ثابت" ہے جبکہ عدم "شیء" ہے۔ پس "وجود" اور "ثبوت" کے مابین فرق کرنے کے باوجود ان میں "اتحاد" ماننے کی وجہ سے یہ "اتحادیہ" میں شامل ہیں کہ ان کے نزدیک "واجب الوجود"، "ممکن الوجود" کا "عین ثابت" ہے۔
اس فلسفے کی معروف بنیادیں دو ہیں ایک یہ کہ "معدوم" بھی "شیء" ہے کہ جس کی "حقیقت"، "ماہیت" یا "عین" ثابت ہے کیونکہ "معلوم" سے تمیز اس کے "شیء" ہونے کو مستلزم ہے۔ اور "معدومات" کے "اعیان" ہی "عین وجود حق" ہیں۔ پس "اعیان ثابتہ" قدیم ہیں یعنی جمیع عالم کا "مادہ" قدیم ہے جبکہ "صورت" حادث ہے۔
پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی "شیء" کے ذہنی اور خارجی وجود میں زمین وآسمان کا فرق ہے اور درجہ علم میں کسی شیء کا ذہنی ثبوت، اس کے خارجی ثبوت کو مستلزم نہیں ہے۔ [الإسراء: 42]؛ [الأنبياء: 22]
اور یہ بھی واضح رہے کہ "فلاسفہ" کے نزدیک "معدومات" مخلوق ہیں جبکہ "ان" کے نزدیک "عین" ہیں۔ پس اگر یہ کہا جائے کہ "معدوم" درجہ علم میں "شیء" ہے تو یہ بات درست ہے لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ "معدوم" فی نفسہ "شیء" ہے،

چاہے وہ درجہ کتابت میں ہی کیوں نہ ہو۔ [أبو داود، سليمان بن الأشعث بن إسحاق السِّجِسْتاني، سنن أبي داود، كِتَاب السُّنَّةِ، بَابٌ فِي الْقَدَرِ، المكتبة العصرية، صيدا - بيروت، 225/4]

دوسری بات یہ ہے کہ "معدوم" کا نہ تو کوئی "ثبوت" ہوتا ہے اور نہ ہی "وجود" جیسا کہ ان کا کہنا ہے کہ "معدوم" کا "ثبوت" تو ہوتا ہے لیکن "وجود" نہیں اور "ثبوت" سے ان کی مراد علمی وجود ہے۔ [مریم: 9]؛ [الطور: 35]

اور ان کا یہ کہنا کہ "وجود" ماہیت اور حقیقت سے زائد ایک صفت ہے، بھی غلط ہے کیونکہ کسی شیء کی "ماہیت" اور "حقیقت" اس کا "عین وجود" ہے۔ [النحل: 40]۔ اس آیت مبارکہ میں "معدوم" کو درجہ علم میں "شیء" قرار دیا گیا ہے۔ اور اگر وہ خارج میں "شیء" ہو تو یہ "تحصیل حاصل" ہے۔ اور "معدوم" سے خطاب "طلب جازم" کا اظہار ہے جیسا کہ انسان کا یہ کہنا کہ "ایسا ہی ہونا چاہیے"۔

ان کی دوسری بنیاد یہ ہے کہ "اعیان ثابتہ"، "عین حق" ہیں اور فرعون کے قول کی بھی یہی "حقیقت" ہے۔ دونوں وجود میں "مشترک" ہیں جبکہ "ماہیت" اور "عین" میں فرق ہے کہ "وجود" ان کے نزدیک صفت زائد ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس قول کے ذریعے انہوں نے "خالق" اور "مخلوق" دونوں کا انکار کیا کیونکہ "مراتب وجود" چار ہیں: علمی، عینی لفظی اور رسمی۔ [العلق: 1-5]

اور اشتراک صرف ذہنی وجود میں ہوتا ہے، خارجی وجود میں اشتراک ممکن نہیں ہے لہٰذا "وجود مطلق" اور "حقائق کونیہ" کا مشترک ہونا غلط ہے کیونکہ یہ "حق" کے خارجی وجود کے انکار کو مستلزم ہے اور اسے صرف ذہنی وجود تک محدود کر دیتا ہے۔ اس قول کے قائل "ظاہر" اور "مظاہر" اور "مجلی" اور "متجلی" میں فرق کرتے ہیں جبکہ ان میں سے بعض کے نزدیک تو وہ ایسا "وجود مطلق" ہے کہ جس میں "تمیز" اور "تعین" نہیں ہے اور جہاں "تمیز" اور "تعین" ہو جائے وہاں "مخلوق" ہے، چاہے "مرتبہ الٰہیہ" میں ہو جائے۔ اور اس قول کا فساد پہلے والے سے بڑھ کر ہے کہ "وجود مطلق" علمی وجود ہے نہ کہ خارجی۔ اور ان میں سے بعض "مطلق" اور "معین" اور "وجود" اور "ماہیت" میں فرق کے بھی قائل نہیں ہیں جیسا کہ سمندر کی موجیں، سمندر اور شعر کے اجزاء، شعر میں داخل ہیں۔ اور اس قول کا فساد پہلے دو سے بھی بڑھ کر ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ "اعیان" کے "ظہور" کے بارے ان کا کہنا یہ ہے کہ "حقائق کونیہ" جو کہ "معدوم" ہیں لیکن ان کے "اعیان" علم الٰہی میں اس "تجلی مطلق" میں "ثابت" ہیں کہ جو ذات الٰہی کے ساتھ متحد ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ حقائق "معدوم" ہیں یا "مخلوق" ہیں۔ اگر تو "معدوم" ہیں تو کچھ موجود نہیں ہے جو عقلاً مستحال ہے اور اگر "معدوم" ہونے کے بعد "موجود" ہیں تو وہ "حق" نہیں ہو سکتے کہ وہ کبھی "معدوم" نہیں رہا۔

تیسری بات یہ ہے کہ جب انہوں نے "اعیان" کو "مظر حق" یا "مجلی الٰہی" کہا تو کیا یہ "عین ذات" ہیں، جیسا کہ ان کا کہنا ہے، تو اس صورت میں مخلوق کا "عین ثابت"، اللہ کی "ذات" ہی ہے۔ یا "حق" نے ان "اعیان" کو روشن کر دیا تاکہ وہ اسے جان سکیں تو اس صورت میں ذات باری تعالیٰ "معدوم" کا "معلوم" بن گئی۔

چوتھی بات یہ ہے کہ ان کا یہ جو کہنا ہے کہ "حق" کے ساتھ کچھ نہیں تھا اور وہ اپنی ذات میں "متجلی" تھا کہ "خلیت

الٰہیہ" کے "نزول" کے ساتھ "حقیقت نبوت" کی گرہ ظاہر ہوئی جو "وجود" کے لیے آئینہ بن گئی اور "حق" اس میں ظاہر ہوا۔ پس ان کے نزدیک "ظاہر" اور "مظہر" ایک ہی ہیں اور اگر "ظہور" سے مراد "وجود" ہے تو "حق" کا ظہور تکرار کے ساتھ ہوا اور اگر "ظہور" سے مراد "وضوح" ہے تو "مخلوق" تو ہے نہیں تو "وضوح" کس کے لیے ہے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ ان کے نزدیک "اعیان ثابتہ" کو چاہے "حق" کہہ لو، چاہے "خلق" کہہ لو، چاہے "حق" اور "خلق" دونوں کہہ لو اور چاہے تو نہ تو "من کل وجہ خلق" اور نہ ہی "من کل وجہ حق" کہہ لو یا کچھ بھی کہہ لو، یا چاہے کسی مقام حیرت میں حیران وپریشان رہو، یہ سب برابر ہے۔

چھٹی بات یہ ہے کہ جسے وہ "سر قدر" کہتے وہ دراصل "جہالت" ہے کہ حق "اعیان" کا محتاج ہے کہ ان پر ایسی ہی "تجلی" ہوتی ہے جیسا کہ ان کی "اقتضاء" ہے لہٰذا ان کے سامنے "عاجز" اور "مجبور" ہے۔ اور ان کے قول کے مطابق "حق" نے وہ جانا جس کا اسے پہلے "علم" نہ تھا حالانکہ وہ ان "ممکنات" کو جانتا ہے جو اس نے پیدا نہیں کیں۔

ساتویں بات یہ ہے کہ ان کا کہنا ہے کہ اسماء، "وجود حق" اور "اعیان" کے مابین "نسبت" اور "اضافت" ہیں۔ اسماء کے احکام، "اعیان ثابتہ" ہیں جو "عدم" میں ہیں۔ اور یہ احکام "اعیان" میں "تجلی حق" کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ اور "اعیان" حق کا آئینہ ہیں کہ جن میں وہ اپنے "اسماء" کو دیکھتا ہے۔ جب وہ "اعیان" میں ظاہر ہوا تو "اسماء کی نسبت" قائم ہوئی اور ظاہری کثرت اسی "نسبت" کی ہے کہ اسماء کے احکام "اعیان" کی صورت میں ظاہر ہوئے اور "وجود" اعیان پر "فائض" ہو کر ان میں "ظاہر" ہوا تو "اعیان" کے پہلو سے "تفرق" حاصل ہوا حالانکہ "وجود مطلق" وہ ہے جو "اذہان" میں "معقول" ہوتا ہے نہ کہ "اعیان" میں "ثابت"۔

اور آخری بات یہ ہے کہ اس فلسفے کے قائلین کا کہنا یہ ہے کہ اس کا مصدر "وحی الٰہی" نہیں بلکہ "کشف والہام" ہے اور کسی متعین شخص کا "کشف والہام" امت کے حق میں "حجت" کیسے ہو سکتا ہے جبکہ خود صاحب کشف کے حق میں بھی اس کے "حجت" ہونے کی کوئی دلیل "نص" میں موجود نہیں ہے۔

ان میں سے وہ بھی ہیں جو اپنے آپ کو "خاتم اولیاء" سمجھتے ہیں اور "خاتم اولیاء" تو "خاتم انبیاء" سے افضل قرار دیتے ہیں اور ان کا یہ خیال ہے کہ تمام انبیاء "خاتم اولیاء" کے "مشکاۃ" سے مستفید ہوتے ہیں۔ یہ اپنی اس "جہالت" کو "توحید خالص" قرار دیتے ہیں جو ان سے پہلے امت میں کسی فقیہہ تو کجا کسی صوفی کو بھی حاصل نہ ہوئی یہاں تک ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ جنید بغدادی بھی اس توحید تک نہیں پہنچ پائے تھے جو ہمیں حاصل ہوئی ہے۔ اور یہی "جہل مرکب" ہے۔

ان کے محبین میں سے بعض نے ان کے پہلے قول کی یہ تاویل کی ہے کہ نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہوتی ہے جو کہ خود ایک دوسری جہالت پر مبنی قول ہے۔ نبی ہر "حال" میں اللہ کا ولی ہوتا ہے، چاہے وہ حال "عبادت" کا ہو یا "رسالت" کا۔ کیا نبی فریضہ رسالت کی ادائیگی میں اللہ کا دشمن ہوتا ہے؟ معاذ اللہ!

پس جس طرح "ارتقاء" کے نظریے نے خدا کے وجود کے انکار کو سائنس بنانے کی ناکام کوشش کی ہے، اسی طرح "تنزل" کے فلسفے نے مخلوق کے وجود کے انکار کو علم بنانے کی سعی لاحاصل کی ہے۔

[6]جس طرح سائنس کے میدان میں کچھ "مذہبی جیالہ پن" موجود ہے اسی طرح بعض مسلمان ماہر انسانیات اور عمرانیات

(Humanists and Social Scientists) میں بھی کچھ ایسے رویہ موجود دیکھنے کو ملتا ہے جیسا کہ بعض مسلم اسکالرز کا یہ وہم ہے کہ مسلم معاشروں میں مغربی الحاد سے پیدا شدہ فساد کا حل "تنزلات ستہ" کے دقیانوسی فلسفے "The Unity of the Being" کو قبول کر لینے میں ہی نظر آتا ہے۔ بعض تو وہ ہیں جنہوں نے اس فلسفے کو انگریزی میں پڑھا ہے، جیسا کہ ملائشیا اور یورپ میں آباد بعض مسلمان مفکرین، کہ جنہوں نے سائیکالوجی کی کچھ جدید بحثوں کو اس کے ساتھ ملا کر ایک عجیب معجون مرکب بنا رکھا ہے۔ اور بعض وہ ہیں کہ جنہوں نے اردو، فارسی یا عربی میں مطالعہ کیا ہے لیکن اس مفروضے کے ساتھ کہ اس جیسی اعلی فکر (intellectual thought) مسلمان امت تو کجا دنیا میں ہی پیدا نہیں ہوئی۔ یہ عقیدہ رکھنا کہ مخلوق کا وجود اُس کا وہم یا خالق کا خیال ہے اور وجود صرف خالق ہی کا ہے، مذہب اور سائنس دنوں کے اعتبار سے "جہل مرکب" ہے۔ اور دوسرا اس مقدمے کو ثابت کرنے کے لیے مذہب اور سائنس کا سہارا لینا ایک ذہنی عیاشی کی مشق سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔ "The Unity of the Being" کے فلسفے کی کوئی ایسی تعبیر کہ جس میں مخلوق کا وجود بھی مانا گیا ہو، چاہے "مثل معدوم" کے درجے میں سہی، تو اس کا حکم الگ ہے۔ اگرچہ ایسی تعبیر اس فلسفے کا معیاری ورژن (standard version) نہیں ہے اور اس کا معیاری ورژن وہی ہے کہ جس میں مخلوق کے وجود کا انکار کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی اس فلسفے کو مختلف معانی میں استعمال کیا گیا ہے کہ جس کا انکار ممکن نہیں ہے۔ علمی اعتبار سے اگرچہ "The Unity of the Being" کی ہر تعبیر کا حکم ایک نہیں ہے لیکن منہج کے پہلو سے ایک ہی حکم جاری ہو گا۔

[7] منہج کے اعتبار سے ہر اس نظریے یا عقیدے پر کم از کم بدعت کے الفاظ کا اطلاق ہو سکتا ہے کہ جس کا مبدا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات نہ ہو اور جس کے حاملین صحابہ اور قرون اولی کی جماعت نہ ہو۔ نہ ہمارے فقہائے اربعہ "The Unity of the Being" کے مذکورہ بالا عقیدے سے واقف تھے اور نہ ہی ائمہ متکلمین کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور بانیان فقہی و کلامی مذاہب امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام ابن حزم، امام ابوالحسن اشعری، امام ابو منصور ماتریدی رحمہم اللہ اجمعین میں سے کسی ایک کا بھی یہ عقیدہ ہر گز نہیں تھا۔ لہٰذا عقیدہ و فقہ میں پیدا ہونے والے جملہ مذاہب و مکاتب فکر کی روایت میں یہ عقیدہ شامل نہیں ہے اور ساتویں صدی ہجری میں پہلی مرتبہ جامع اور مرتب صورت میں پیش کیا گیا۔ عقلی و منطقی اعتبار سے اس کے غلط ہونے کے لیے صریح شرعی نصوص، عقل عام (common sense) کے علاوہ وہ سب تحقیقی کام کافی و شافی دلیل ہے جو سائنسی علوم (Natural Sciences) میں امر واقعہ (fact) بن چکا ہے۔

[8] سائنس کا تو ویسے ہی یہ موضوع نہیں ہے اور فلسفہ، عمرانیات (Sociology)، نفسیات (Psychology)، بیالوجی (Biology)، علم الانسان (Anthropology)، علم الآثار (Archeology) اور نظریاتی فزکس (Theoretical Physics) کے جمیع بیانیوں (narratives) میں انسان کے مبدا و معاد (Alpha and Omega) کے سوال کے بارے اتنا جواب موجود نہیں ہے کہ جتنا آسمانی مذاہب (Semitic Religions) میں سے کسی ایک مذہب کے بیان میں موجود ہے۔ علاوہ ازیں انسانی اور عمرانی علوم (Humanities and Social Sciences) میں ایسے

نظریات موجود ہیں کہ انسان خود ہی مذہب اور خدا دونوں کا خالق ہے لیکن ان جمیع نظریات کے حق میں سائنسی وروایتی شواہد موجود نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں ماہرین عمرانیات (Social Scientists) کا اس بارے کسی ایک بیانیے پر اتفاق "ممتنع" (impossible) ہے جبکہ اختلاف زمان ومکان کے باوجود حضرت آدم علیہ السلام سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء ورسل کا دعوی اور بیان ایک ہی رہا ہے اور وہ "توحید" ہے۔ [البقرة: 257]؛ [المائدة: 15-16]

[9] [هود: 7]؛ [صحيح البخاري، كِتَابُ التَّوْحِيدِ، بَابُ {وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الماءِ}، 124/9]؛ [سنن الترمذي، أَبْوَابُ تَفْسِيرِ الْقُرْآنِ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، بَابٌ: وَمِنْ سُورَةِ هُودٍ، 139/5]

[10] [سنن أبي داود، كِتَاب السُّنَّةِ، بَابٌ فِي الْقَدَرِ، 225/4]

[11] [البقرة: 29]؛ [فصلت: 9-12]

[12] [الأعراف: 54]؛ [يونس: 3]؛ [الرعد: 2]؛ [طه: 4-6]؛ [السجدة: 4]؛ [الحديد: 4]

[13] [الحج: 18]؛ [الذاريات: 56]؛ [الأنبياء: 25]

[14] [المؤمنون: 115]؛ [الملك: 2]

[15] [الذاريات: 56]؛ [الملك: 2]؛ [هود: 7]

[16] [مسلم بن الحجاج أبو الحسن القشيري النيسابوري، المسند الصحيح المختصر بنقل العدل عن العدل إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم المعروف بصحيح المسلم، كِتَابُ الزُّهْدِ وَالرَّقَائِقِ، بَابٌ فِي أَحَادِيثَ مُتَفَرِّقَةٍ، دار إحياء التراث العربي - بيروت، 2294/4]

[17] [البقرة: 30]

[18] [الحجر: 29]

[19] [سنن أبي داود، كِتَاب السُّنَّةِ، بَابٌ فِي الْقَدَرِ، 222/4]

[20] [المؤمنون: 12]

[21] [صّ: 75]

[22] [صحيح المسلم، كتاب الْبِرِّ وَالصِّلَةِ وَالْآدَابِ، بَابُ خَلْقِ الْإِنْسَانِ خَلْقًا لَا يَتَمَالَكُ، 2016/4]

[23] [السجدة: 9]

[24] [البقرة: 30]

[25] [الكهف: 50]

[26] [الأعراف: 11-17]

[27] [النساء: 1]

[28] [السجدة: 7-8]؛ [الفرقان: 54]؛ [الأنبياء: 30]

[29] [البقرة: 35]

[30][الأعراف: 24-25]

[31][البقرة: 38-39]

[32][الذاريات: 1-6]؛ [يونس: 4]؛ [الأنبياء: 104]؛ [الأنبياء: 109]؛ [يس: 21-63]؛ [إبراهيم: 42-52]

[33][الشورى: 13]؛ [الأحزاب: 7]؛ [آل عمران: 33-34]؛ [صحيح مسلم، كِتَابُ الْإِيمَانَ، بَابُ أَدْنَى أَهْلِ الْجَنَّةِ مَنْزِلَةً فِيهَا، 186/1-187]؛ [المستدرك على الصحيحين، كِتَابُ تَوَارِيخِ الْمُتَقَدِّمِينَ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ، ذِكْرُ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، 595/2]

[34]اہل تاریخ نے دنیا کی تاریخ کو جو مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے، یہ تقسیم "مذہب" کے بیان کی روشنی میں "قابل اصلاح" ہے۔ پہلا اور دوسرا دور تو وہ ہے جسے اہل تاریخ "ماقبل تاریخ/قدیم حجری دور" [Paleolithic age (2,500,000-20,000/12,000 BCE), Britannica] اور "جدید حجری دور" [Neolithic age (12,000-4,500/3,500/3,300 BCE), ASPRO] جبکہ تیسرے اور چوتھے کو "کانسی کا دور" [Bronze age (3,000-1,200 BCE), Britannica] اور "لوہے کا دور" [Iron age (1,200-500 BCE-CE), Britannica] کا نام دیتے ہیں۔ اور پانچواں "قرون وسطی" [Middle ages (500-1,500 CE), Britannica] کا دور جبکہ آخری اور معاصر دور "دور جدید" [Modern Age] ہے۔ بہر حال اہل مذہب کو اُنہی پانچ ادوار کی روشنی میں تاریخ انسانی کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ جو ہم نے اوپر متن میں نقل کر دیے ہیں کیونکہ یہ تقسیم ایک واقعی امر ہے نہ کہ محض "فرضیہ" (hypothesis)۔ آخری اور معاصر دور کا آغاز محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا ہے اور یہی "دور جدید" ہے کہ جس کا اختتام "الساعۃ/الواقعہ/القیامۃ" پر ہو گا۔

[35][البقرة: 31-36]؛ [المائدة: 48]؛ [صحيح مسلم، كِتَابُ الْإِيمَانَ، بَابُ أَدْنَى أَهْلِ الْجَنَّةِ مَنْزِلَةً فِيهَا، 186/1-187]؛ [صحيح مسلم، كتاب الْقَدَرِ، بَابُ حِجَاجِ آدَمَ وَمُوسَى عَلَيْهِمَا السَّلَامُ، 2043/4]

[36][المستدرك على الصحيحين، كِتَابُ تَوَارِيخِ الْمُتَقَدِّمِينَ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ، ذِكْرُ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، دار الكتب العلمية – بيروت، الأولى، 1411 – 1990، 591/2]

سری لنکا کے شہر "رتنا پورہ" کے جنوب مشرق میں 40 میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی "سری پادا" کی چوٹی پر پانچ فٹ چار انچ لمبے اور چھ انچ چوڑے پاؤں کا نشان ہے۔ اس پہاڑ کی چوٹی کو مقامی مسلمان اور عیسائی " آدم کی چوٹی" (Adam's Peak) کا نام دیتے ہیں اور ان کے ہاں معروف زبانی روایت (oral tradition) کے مطابق آدم جنت سے زمین پر یہاں اتارے گئے تھے۔

[37][المستدرك على الصحيحين، كِتَابُ تَوَارِيخِ الْمُتَقَدِّمِينَ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ، ذِكْرُ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، 592/2]

آدم کا بیٹا قائن "عدن" کے مشرق میں "نود" کے علاقہ میں آباد ہوا اور وہاں اپنے بیٹے "حنوک" کے نام سے ایک شہر آباد کیا۔ حنوک سے عیراد، عیراد سے محویائیل، محویائیل سے متوسائیل، متوسائیل سے لمک پیدا ہوا۔ لمک سے یابل،

یوبل اور بلقائن پیدا ہوئے۔ یابل کی اولاد نے خانہ بدوشی اختیار کی جبکہ یوبل کی اولاد نے آلات موسیقی بانسری وغیرہ ایجاد کی۔ اور بلقائن نے لوہے اور پیتل کے ہتھیار بنائے۔[عہد نامہ قدیم: پیدائش: 4: 1-23]

[38] [البقرة: 31-33]؛ [صحيح البخاري، كِتَابُ تَفْسِيرِ القُرْآنِ، بَابُ قَوْلِ اللَّهِ: {وَعَلَّمَ آدَمَ الأَسْمَاءَ كُلَّهَا، 17/6]؛ [الطبري، أبو جعفر محمد بن جرير بن يزيد الآملي، جامع البيان عن تأويل آي القرآن = تفسير الطبري، دار هجر للطباعة والنشر والتوزيع والإعلان، الأولى، 1422 هـ - 2001 م، 514/1]؛ [تفسير الطبري: 515/1]؛ [تفسير الطبري: 517/1]

آدم کی تنہائی دور کرنے کے لیے خدا نے مٹی سے جانور اور پرندے بنائے اور انہیں آدم کے سامنے رکھا اور آدم نے ان کو جس نام سے پکارا، وہی ان کا نام ٹھہرا۔[عہد نامہ قدیم: پیدائش: 2: 1-25]؛ زبان کا اختلاف پہلی مرتبہ نوح کی اولاد میں اس وقت سامنے آیا جبکہ انہوں نے روئے زمین پر پہلی مرتبہ اینٹوں کو آگ میں پکا کر "بابل" کا شہر آباد کرنا چاہا اور اس شہر میں آسمانوں کی بلندیوں کو پہنچنے والا برج بنانے کا ارادہ کیا تا کہ دنیا میں کا نام باقی رہے تو خدا نے انہیں اس مقصد سے باز رکھنے کے لیے زمین میں پراگندہ کر دیا اور ان کی زبانوں میں اختلاف ڈال دیا۔[عہد نامہ قدیم: پیدائش: 11 : 1-10]

[39] [المستدرك على الصحيحين، كِتَابُ تَوَارِيخِ الْمُتَقَدِّمِينَ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ، ذِكْرُ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، 593/2]

[40] [الطبراني، أبو القاسم سليمان بن أحمد بن أيوب الشامي، المعْجَمُ الكَبِير للطبراني، مكتبة ابن تيمية — القاهرة، 343/13]؛ [صحيح مسلم، كتاب الْجَنَّةِ وَصِفَةِ نَعِيمِهَا وَأَهْلِهَا، بَابُ مَا فِي الدُّنْيَا مِنْ أَنْهَارِ الْجَنَّةِ، 2183/4]؛ [صحيح البخاري، كِتَابُ بَدْءِ الخَلْقِ، بَابُ ذِكْرِ المِلاَئِكَةِ، 109/4]

خدا نے آدم کو زمین کے مشرق میں "عدن" کے مقام پر ایک "باغ" میں رکھا۔ "عدن" سے ایک دریا "باغ" کو سیراب کرنے کے لیے نکلا اور چار ندیوں میں تقسیم ہوا۔ "فیسون" کی وادی "حویلہ" کی سرزمین جبکہ "جیحون" کی وادی "کوش" کی وادی کو سیراب کرتی تھی۔ تیسری "دجلہ" کی وادی اور چوتھی "فرات" ہے۔[عہد نامہ قدیم: پیدائش: 2: 1-25]؛ آدم کا بیٹا قائن "عدن" کے مشرق میں "نود" کے علاقہ میں آباد ہوا اور وہاں اپنے بیٹے "حنوک" کے نام سے ایک شہر آباد کیا۔[عہد نامہ قدیم: پیدائش: 4: 1-23]

آدم کی پیدائش اور جنت رکھے جانے کا قصہ ہمیں سمیری (Sumerian) تہذیب کی قدیم ترین نظم "رزمیہ گلگامش" (Epic of Gilgamesh) میں بھی ملتا ہے۔ یہ نظم "بابل" (Babylon) شہر کی کھدائی کے دوران 1800(BC) کے زمانے میں لکھی گئی تختیوں پر ملی ہے۔ "اترا ہاسس" (Atra-Hasis) جو کہ "اکادی" (Akkadian) تہذیب کے باقیات کی ایک رزمیہ نظم ہے کہ جس کے تقریباً 1650 (BC)ء کے دور کے نسخے دریافت ہوئے ہیں۔ اس نظم میں بھی آدم کی پیدائش اور طوفان نوح، دونوں قصے موجود ہیں۔ سمیری بادشاہوں کی فہرست میں "اریدو" (Eridu) کو پہلے سمیری بادشاہ کا شہر قرار دیا گیا ہے جو کہ عراق میں "اُور" (Ur) کے شہر سے 12 کلومیٹر جنوب مغرب میں واقع ہے۔ سمیری تہذیب ہی کے ایک اور قصے "زیو سدرا" (Ziusudra) میں بھی

تخلیق اور طوفان کا قصہ موجود ہے۔ علاوہ ازیں اس قصے کے مطابق طوفان سے پہلے آباد کیے جانے والوں شہروں میں پہلا شہر "اریدو" (Eridu) جبکہ دوسرا عراق کا شہر "بادتبیرا" (Bad-Tibira) ہے۔ تیسرا "لارسا" (Larsa)، چوتھا "سیپار" (Sippar) اور پانچواں "شوروپاک" (Shuruppak) ہے اور یہ سب شہر عراق میں ہی پاس پاس ہی موجود ہیں۔ "حکمائے سبعہ لما بین النھرین" (Mesopotamian Seven Sages) میں پہلے حکیم "اداپا" (Adapa) کے قصے میں بھی تخلیق کے واقعے کا ذکر ہے اور اس واقعہ کے مخطوطات(manuscrpts) تقریباً 1400(BC) کے زمانے کے ہیں۔

[41] [صحيح ابن حبان، كِتَابُ التَّارِيخ، بَابُ بَدْءِ الْخَلْقِ ذِكْرُ الْإِخْبَارِ عَمَّا كَانَ بَيْنَ آدَمَ وَنُوح صَلَوَاتُ اللَّهِ عَلَيْهِمَا مِنَ الْقُرُونِ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الأولى، 1408 هـ - 1988 م، 69/14؛ سلسلة الأحاديث الصحيحة وشيء من فقهها وفوائدها: 358/6-360]

آدم سے سیت، سیت سے انوس، انوس سے قینان، قینان سے محلل ایل، محلل ایل سے یارد، یارد سے حنوک، حنوک سے متوسلح، متوسلح سے لمک اور لمک سے نوح پیدا ہوئے۔[عہد نامہ قدیم: پیدائش: 5: 1-32] "بائبل" کے بیان کے مطابق آدم اور نوح علیہما الصلاۃ والسلام کے مابین 1056 برس کا فرق ہے۔[عہد نامہ قدیم: پیدائش: 5 : 1-32]

[42] [البقرة: 213]؛ [المستدرك على الصحيحين، كِتَابُ تَوَارِيخِ الْمُتَقَدِّمِينَ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ، ذِكْرُ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، 596/2]

[43] [نوح: 23-24]؛ [صحيح البخاري، كِتَابُ تَفْسِيرِ القُرْآنِ، بَابُ {وَدًّا وَلاَ سُوَاعًا، وَلاَ يَغُوثَ وَيَعُوقَ}، 160/6]؛ [المستدرك على الصحيحين، كِتَابُ تَوَارِيخِ الْمُتَقَدِّمِينَ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ، ذِكْرُ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، 596/2]

[44] [هود: 44]

زبان کا اختلاف پہلی مرتبہ نوح کی اولاد میں اس وقت سامنے آیا جبکہ انہوں نے روئے زمین پر پہلی مرتبہ اینٹوں کو آگ میں پکا کر "بابل" کا شہر آباد کرنا چاہا اور اس شہر میں آسمانوں کی بلندیوں کو پہنچنے والا برج بنانے کا ارادہ کیا تاکہ دنیا میں ان کا نام باقی رہے تو خدا نے انہیں اس مقصد سے باز رکھنے کے لیے زمین میں پراگندہ کر دیا اور ان کی زبانوں میں اختلاف ڈال دیا۔[عہد نامہ قدیم: پیدائش: 11 : 1-10]

[45] [الصافات: 75-77]؛ [يونس: 73-74]؛ [الحديد: 26]؛ [الفرقان: 37-38]؛ [العنكبوت: 14]

"نُوح کے بیٹے جو کشتی سے نکلے سم، حام اور یافت تھے اور حام کنعان کا باپ تھا۔ یہی تینوں نُوح کے بیٹے تھے اور اِن ہی کی نسل ساری زمین پر پھیلی ۔" [عہد نامہ قدیم: پیدائش: 9: 18-19]

اس "طوفان" اور "کشتی" کا ذکر ہمیں سمیری (Sumerian) تہذیب کی قدیم ترین نظم "رزمیہ گلگامش" (Epic of Gilgamesh) میں بھی ملتا ہے۔ یہ نظم "بابل" (Babylon) شہر کی کھدائی کے دوران 1800(BC) کے

زمانے میں لکھی گئی تختیوں پر ملی ہے۔

[46][المستدرك على الصحيحين، كِتَابُ تَوَارِيخِ الْمُتَقَدِّمِينَ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ، ذِكْرُ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، 595/2]

[47][سنن الترمذي، أَبْوَابُ الْمَنَاقِبِ، بَابٌ فِي فَضْلِ العَرَبِ، 213/6]

"سام" کی اولاد میں عیلام، اسور، ارفکسد، لود اور ارام ہیں۔ "ارام" کی اولاد میں عوض، حول، جتر اور مس ہیں جبکہ "ارفکسد" سے سلح، سلح سے عبر، عبر سے فلج اور یقطان پیدا ہوئے۔اور "یقطان" سے موداد، سلف، حصار ماوات، اراخ، ہدورام، اوزال، دقلہ، عوبل، ابی مائیل، سبا، اوفیر، حویلہ اور یوباب پیدا ہوئے۔ "حام" کی اولاد میں کوش، مصر، فوط اور کنعان ہیں۔ "کوش" کی اولاد میں سبا، حویلہ، سبتہ، رعماہ، سبتیکہ، نمرود ہیں جبکہ "مصر" سے لودی، عنامی، الہامی، نفتوحی، فتروسی، کسلوحی اور کفتوری پیدا ہوئے۔ "کنعان" سے صیدا، حت، یبوسی، اموری، جرجاسی، حوی، عرقی، سینی، اروادی، صماری، حماتی ہیں۔ "رعماہ" کی اولاد میں سبا اور ددان ہیں۔ "یافت" کی اولاد میں جمر، ماجوج، مادی، یاوان، توبل، مسک اور تیراس ہیں۔ "جمر" کی اولاد میں اشکناز، ریفت اور تجرمہ جبکہ "یاوان" کے بیٹوں میں الیسہ، ترسیس، کتی اور دودانی ہیں۔[عہد نامہ قدیم: پیدائش: 10: 1-32]

[48][المستدرك على الصحيحين، كِتَابُ تَوَارِيخِ الْمُتَقَدِّمِينَ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ، ذِكْرُ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، 288/2؛ سلسلة الأحاديث الصحيحة وشيء من فقهها وفوائدها: 852/7-855]

نوح سے سم، سم سے ارفکسد، ارفکسد سے سلح، سلح سے عبر، عبر سے فلج، فلج سے رعو، رعو سے سروج، سروج سے نحور، نحور سے تارخ اور تارخ سے ابرام، نحور اور حاران پیدا ہوئے۔ اور حاران سے لوط پیدا ہوئے۔[عہد نامہ قدیم: پیدائش: 5: 32] بائبل کے بیان کے مطابق نوح سے ابراہیم تک 890 برس کا فرق ہے۔[عہد نامہ قدیم: پیدائش: 11: 1-32]

[49][الأعراف: 65-69]؛ [الشعراء: 123-130]؛ [الأحقاف: 21]؛ [الفجر: 6-8]

[50][الأعراف: 73-74]؛ [العنكبوت: 38]؛ [الأحقاف: 27]؛ [الشعراء: 141-149]؛ [الحجر: 80-84]

[51][التوبة: 70]؛ [الأنبياء: 51-54]؛ [الصافات: 97-99]؛ [العنكبوت: 26-29]؛ [العنكبوت: 36-37]؛ [الأنبياء: 71]؛ [الحجر: 73-79]؛ [الشعراء: 176-177]؛ [الفرقان: 40]

[52][الحديد: 26]؛ [العنكبوت: 27]

[53][الأنعام: 84-86]

[54][البقرة: 127-129]؛ [الصف: 6]

[55][المؤمنون: 117]؛ [النحل: 36]؛ [التغابن: 7]؛ [الجاثية: 24-32]

[56][المائدة: 50]

[57][آل عمران: 19]

[58][آل عمران: 85]

[59][فاطر: 24]؛ [الرعد: 17]

[60][صحيح البخاري، كِتَابُ أَحَادِيثِ الأَنْبِيَاءِ، بَابُ قَوْلِ اللَّهِ {وَاذْكُرْ فِي الكِتَابِ مَرْيَمَ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا}، 167/4]

[61][المائدة: 48]

[62][صحيح مسلم، كِتَابُ الْإِيمَانَ، بَابُ نُزُولِ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ حَاكِمًا بِشَرِيعَةِ نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، 137/1]

[63]اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم تک قرآن وسنت کیسے منتقل ہوئے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ دوسرا قابل غور نکتہ یہ ہے کہ کیا قرآن وسنت اس بارے میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے قرآن وسنت کی صورت میں جو دین حاصل کیا ہے وہ قیامت تک آنے والے آپ کے ہر ہر امتی تک کن ذرائع سے پہنچے گا ؟ تیسرا تحقیق طلب سوال یہ ہے کہ قرآن وسنت نے ایسے کون سے ذرائع بیان کیے ہیں کہ جن سے دین اسلام آپ کی طرف سے کسی امتی تک پہنچ جائے تو اس امتی کے لیے اس ذریعے کی صورت میں ملنے والے دین کو، دین اسلام سمجھ کر قبول کرنا واجب ہے ؟آج میرے لیے دین اسلام کے مآخذ کیا ہیں؟ یعنی جو دین اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی طرف سے بذریعہ وحی ملا ہے آج مجھے وہ کہاں ملے گا؟آج میں اسے کہاں تلاش کروں؟ کیا اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کردہ دین کی حفاظت اس طرح سے کی ہے کہ آج بھی مجھے وہ دین اسی طرح مل جائے جس صورت میں وہ آپ پر نازل ہوا تھا؟ میرے سامنے آج اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہیں ہیں کہ میں ان کے اقوال، افعال اور تقریرات کا براہ راست مشاہدہ کر کے دین آپ کی ذات سے اخذ کر سکوں۔

[64][الكهف: 65-78]

معاصر سائنسی علم میں سے اکثر وہ ہے جو صرف سائنسدان کا مشاہدہ یا تجربہ ہے جبکہ بقیہ دنیا کے لیے وہ ایک خبر ہی ہے۔ قدیم انسان کی تاریخ کا مطالعہ "زبانی خبر" (oral tradition) کی روشنی میں کیا جائے یا "علم الآثار" (Archeology) کی صورت میں ، "نسب شناسی" (Genealogy) کی روشنی میں ہو یا "علم النقائش" (Epigraphy) کی صورت میں، ہر پہلو سے وہ ایک عامی کے لیے خبر ہی ہے۔

[65][المائدة: 43]

"پھر موسیٰ نے سب اسرائیلیوں کو بلوا کر ان سے کہا: اے اسرائیلیو! تم ان آئین اور احکام کو سن لو جن کو میں آج تم کو سناتا ہوں تا کہ تم ان کو سیکھ کر ان پر عمل کرو... میرے آگے تو اور معبودوں کو نہ ماننا۔ تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا، نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان میں یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے۔ تو ان کے آگے سجدہ نہ کرنا اور نہ ان کی عبادت کرنا کیونکہ میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں۔ اور جو مجھ سے عداوت رکھتے ہیں ان کی اولاد کو تیسری اور چوتھی پشت تک باپ دادا کی بدکاری کی سزا دیتا ہوں۔ اور ہزاروں پر جو مجھ سے محبت رکھتے اور میرے

حکموں کو مانتے ہیں، رحم کرتا ہوں۔ تو خداوند اپنے خداوند کا نام بے فائدہ نہ لینا کیونکہ خداوند اس کو جو اس کا نام بے فائدہ لیتا ہے، بے گناہ نہ ٹھہرائے گا۔ تو خداوند اپنے خدا کے حکم کے مطابق سبت کے دن کو یاد کر کے پاک ماننا۔ چھ دن تک تو محنت کر کے اپنا سارا کام کاج کرنا۔ لیکن ساتواں دن خداوند تیرے خدا کا سبت ہے۔ اس میں نہ تو کوئی کام کرے، نہ تیرا بیٹا، نہ تیری بیٹی، نہ تیرا غلام، نہ تیری لونڈی، نہ تیرا بیل، نہ تیرا گدھا، نہ تیرا اور کوئی جانور، اور نہ کوئی مسافر جو تیرے پھاٹکوں کے اندر ہوتا، کہ تیرا غلام اور تیری لونڈی بھی تیری طرح آرام کریں۔ اپنے باپ اور اپنی ماں کی عزت کرنا جیسا خداوند تیرے خدا نے تجھے حکم دیا ہے تا کہ تیری عمر دراز ہو اور جو ملک خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے اس میں تیرا بھلا ہو۔ تو خون نہ کرنا۔ تو زنا نہ کرنا۔ تو چوری نہ کرنا۔ تو اپنے پڑوسی کی بیوی کا لالچ نہ کرنا اور نہ اپنے پڑوسی کے گھر یا اس کے کھیت یا غلام یا لونڈی یا بیل یا گدھے یا اس کی کسی اور چیز کا خواہاں ہونا۔ یہی باتیں خداوند نے اس پہاڑ پر آگ اور گھٹا اور ظلمت میں سے تمہاری ساری جماعت کو بلند آواز سے کہیں اور اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہا اور ان ہی کو اس نے پتھر کی دو لوحوں پر لکھا اور ان کو میرے سپرد کیا۔" [عہد عتیق: استثناء: باب 5: آیت 7-23]؛ "اور دیکھو ایک شخص نے پاس آکر اس سے کہا: اے استاد! میں کون سی نیکی کروں تا کہ ہمیشہ کی زندگی پاؤں؟ اس نے اس سے کہا: تو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں پوچھتا ہے؟ نیک تو ایک ہی ہے۔ لیکن اگر تو زندگی میں داخل ہونا چاہتا ہے تو حکموں پر عمل کر۔ اس نے اس سے کہا: کون سے حکموں پر؟ یسوع نے کہا: یہ کہ خون نہ کر۔ زنا نہ کر۔ چوری نہ کر۔ جھوٹی گواہی نہ دے۔ اپنے باپ دادا کی اور ماں کی عزت کر۔ اور اپنے پڑوسی سے اپنی مانند محبت رکھ۔ اس جوان نے اس سے کہا: کہ میں نے ان سب پر عمل کیا ہے۔ اب مجھ میں کس بات کی کمی ہے؟ یسوع نے اس سے کہا: اگر تو کامل ہونا چاہتا ہے تو جا، اپنا مال واسباب بیچ کر غریبوں کو دے۔ تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا اور آکر میرے پیچھے ہو لے۔ مگر وہ جوان یہ بات سن کر غمگیں ہو کر چلا گیا کیونکہ بڑا مالدار تھا۔ اور یسوع نے اپنے شاگردوں سے کہا: میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولتمند کا آسمان کی بادشاہی میں داخل ہونا مشکل ہے۔ اور پھر تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولتمند خدا کی بادشاہی میں داخل ہو۔ شاگرد یہ سن کر بہت ہی حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ پھر کون نجات پا سکتا ہے؟ یسوع نے ان کی طرف دیکھ کر کہا کہ یہ آدمیوں سے تو نہیں ہو سکتا لیکن خدا سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔" [عہد نامہ جدید: متی: باب 19: آیت 17-27]

قدیم ضابطہ حیات "حمورابی کا قانون" (Code of Hammurabi) میں بھی مذکورہ بالا بعض احکامات کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے جو کہ غالباً "صحف ابراہیم" کا "اثر علمی" ہے۔ یہ قانون 1750(BC) میں "بابل" میں مرتب کیا گیا تھا۔

[66] [البقرة: 79]؛ [البقرة: 174]

[67] [البقرة: 75]؛ [المائدة: 78]

How can you say, 'We are wise, And the law of the LORD is with us'? But behold, the lying pen of the scribes Has made it into a lie. [New

American Standard Bible: Old Testament: Jeremiah: 8:8]; and you have perverted the words of the living God, the LORD of hosts, our God [New American Standard Bible: Old Testament: 23:36]; All day long they distort my words [New American Standard Bible: Old Testament: Psalm: 56:5]

[68] [آل عمران: 19-20]۔ البتہ قدیم انسان کی تاریخ (Anthropology) کے مطالعہ کے لیے موجود مصادر میں سابقہ آسمانی کتب جامع ترین اور بہترین ماخذ ہیں، خاص طور "بحیرہ مردار کے مخطوطات" (dead sea scrolls) کی دریافت کے بعد ان کی یہ تاریخی حیثیت مسلم (authentic) ہو چکی ہے۔ یہ مخطوطات 1946 سے 1956 کے درمیان "بحیرہ مردار" (dead see) کے شمال مغرب میں دو کلومیٹر کے فاصلے پر موجود 11 غاروں سے برآمد ہوئے اور ان کی کل تعداد 981 ہے۔ یہ مخطوطات 408(BC) سے 318(CE) تک کے زمانے میں لکھے گئے تھے اور یہ یونانی (Greek)، عبرانی (Hebrew)، آرامی (Aramaic) اور نبطی (Nabataean) زبانوں میں ہیں۔

[69] [المائدة: 81]؛ [أحمد بن محمد بن حنبل بن هلال بن أسد الشيباني، أبو عبد الله، مسند الإمام أحمد بن حنبل، مؤسسة الرسالة، 2001 م، 349/23؛ محمد ناصر الدين الألباني، إرواء الغليل في تخريج أحاديث منار السبيل، المكتب الإسلامي – بيروت، 1985م، 34/6]؛ [صحيح المسلم، كِتَابُ الْإِيمَانَ، باب وجوب إيمان أهل الكتاب برسالة الإسلام، 34/1]

[70] [المائدة: 48]

[71] [المائدة: 81]؛ [مسند الإمام أحمد بن حنبل: 349/23؛ إرواء الغليل في تخريج أحاديث منار السبيل: 34/6]

[72] خبر وہ ہے جس میں صدق و کذب کا احتمال ہو۔ اگر ان دو پہلوؤں میں سے ایک قطع ہو جائے تو اسے "خبر قطعی" کہتے ہیں۔ یہ قطعیت اگر تحقیق کے بغیر حاصل ہو تو اسے "متواتر" کہتے ہیں اور تحقیق کے بعد حاصل ہو تو "صحیح" کہتے ہیں۔ خبر "متواتر" ہر حال میں یقین کا فائدہ دیتی ہے جبکہ "صحیح" خبر تحقیق سے پہلے ظن اور تحقیق کے بعد یقین کا فائدہ دیتی ہے۔ چونکہ قطعیت خبر کا خاصہ ہے نہ کہ مخبر کا لہٰذا اس کا دارومدار مخبرین کی تعداد کی کمی بیشی نہیں ہے جیسا کہ متاخرین میں "متواتر" اسی معنی میں معروف ہو گئی کہ جسے "جم غفیر" روایت کرے۔ سلف صالحین، ائمہ دین، فقہائے اربعہ اور محدثین عظام رحمہم اللہ "متواتر" کی اس صطلاح سے ناواقف تھے۔ یہ اصطلاح یونانی منطق سے اصول فقہ میں اور اصول فقہ سے اصول حدیث میں داخل ہوئی۔ علاوہ ازیں یہ ایک ایسی اصطلاح ہے کہ جس کا نہ تو کوئی معنی متعین ہے اور نہ ہی کوئی مسمّٰی معلوم ہے۔ درست بات یہ ہے کہ تواتر ایک سے بھی حاصل ہو جاتا ہے جیسا کہ مالک عن نافع عن عبد اللہ بن عمر ایک متواتر سند ہے۔ [ابن الصلاح، عثمان بن عبد الرحمن، أبوعمرو تقي الدين، معرفة أنواع علوم الحديث، ويُعرف بمقدمة ابن الصلاح، دار الفكر المعاصر – بيروت، 1406هـ - 1986م، 167-268]

جبکہ رد قبول کے اعتبار سے خبر کی دو قسمیں ہیں: مقبول اور مردود۔ مقبول وہ ہے جو دین میں حجت ہے جبکہ مردود حجت

نہیں ہے۔ مقبول کی چار قسمیں ہیں: صحیح لذاتہ، صحیح لغیرہ، حسن لذاتہ اور حسن لغیرہ۔ پہلی تین قسمیں تحقیق سے پہلے ظن جبکہ تحقیق کے بعد یقین کا فائدہ دیتی ہیں جبکہ حسن لغیرہ ظنی الثبوت ہے۔ مردود روایت طعن فی الراوی کے اعتبار سے موضوع، متروک، منکر، مدرج، مضطرب، مصحف، مجہول میں تقسیم ہوتی ہے جبکہ سند کے انقطاع کے پہلو سے معلق، منقطع، معضل، مرسل، مدلس اور مرسل خفی میں تقسیم ہوتی ہے۔

[73] [الشافعي، أبو عبد الله محمد بن إدريس بن العباس القرشي المكي، الرسالة، مكتبه الحلبي، مصر، 1940ء، 401-403]؛ [الرسالة: 403-404]؛ [الرسالة: 404-406]

صحابہ دو صورتوں میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے دین حاصل کر رہے تھے: یا تو براہ راست آپ کی مجلس میں موجود ہوتے تھے یا کسی دوسرے صحابی سے اس کی خبر پاتے تھے۔ پہلی صورت میں بھی آپ کی خبر ان کے لیے خبر واحد تھی جبکہ دوسری صورت بھی عموماً خبر واحد ہی کی ہوتی تھی جیسا کہ صحابہ آپ کے ارشادات وافعال اور موقع بموقع نازل ہونے والی قرآنی آیات کی خبر اپنی بیویوں کو جا کر دیتے تھے تو یہ خبر واحد ہی تھی۔ اس خبر واحد سے قرآن بھی ثابت ہو رہا تھا اور حلال وحرام بھی، عبادات بھی اور معاملات بھی، آداب بھی اور حدود وتعزیرات بھی۔ جب تک صحابہ کا کسی بات پر اجماع نہیں ہوا تھا اور کسی ایک صحابی نے کسی دوسرے صحابی سے مثلاً تحویل قبلہ سے متعلق قرآن کی نئی نئی نازل شدہ آیات سنی تھیں تو اس صحابی کے لیے وہ خبر واحد مستقل بالذات ماخذ دین تھی یا نہیں اور اس خبر واحد سے قرآن اور تحویل قبلہ جیسا حکم ثابت ہو جاتا تھا یا نہیں؟ اگر تو جواب اثبات میں ہے اور یقیناً ہے تو آج اس خبر واحد سے قرآن یا تحویل قبلہ جیسے احکامات کے اثبات میں کیا مانع ہے؟ کیا صحابہ کے دور میں جس قسم کی خبر واحد سے مستقل بالذات دین ثابت ہو جاتا تھا اور امام شافعی، امام مالک، امام احمد اور امام بخاری رحمہم اللہ وغیرہ کے زمانے میں اس خبر واحد سے دین ثابت نہیں ہوتا تھا؟ کیا ذریعہ دین پر حکم ہے کہ وہ دین کو مستقل بالذات یا غیر مستقل بالذات بنا دیتا ہے؟ مستقل بالذات دین کے ثبوت کے طریقے جو خود دین نے بیان کیے ہیں وہ اجماع نہیں ہے بلکہ "خبر صحیح" ہے۔ مزید تفصیل کے لیے کتاب "فکر غامدی" کے باب اول "دین کی روایت" کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

[74] بعض لوگ تفسیری اقوال، سیرت اور تاریخ کی خبر پر بھی اصول حدیث کی روشنی میں حکم لگانا شروع کر دیتے ہیں جو کسی طور درست نہیں ہے۔ کتاب وسنت دین ہیں جبکہ تفسیری اقوال، سیرت اور تاریخ کسی طور بھی دین نہیں ہیں کہ ان کی تحقیق کے لیے بھی دین کی روایت کے اصول لاگو کیے جائیں۔ [أكرم ضياء العمري، الدكتور، دراسات تاريخية مع تعليقة في منهج البحث وتحقيق المخطوطات، الجامعة الإسلامية بالمدينة المنورة، الطبعة الأولى 1403 هـ - 1983 م، 27]؛ [ابن حجر العسقلاني، أبو الفضل أحمد بن علي بن محمد بن أحمد، تقريب التهذيب، دار الرشيد – سوريا الأولى، 1406 – 1986، 498/1]؛ [تقريب التهذيب: 262/1]؛ [ابن تيمية، مقدمة في أصول التفسير، دار مكتبة الحياة، بيروت، لبنان، 1490هـ/ 1980م، 22-28]

[75] [يوسف: 2]

[76] ابن عباس رضی اللہ عنہ، ابو الحسن اشعری اور ابن فارس رحمہما اللہ کے نزدیک "تلقین" ہے جبکہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے

نزدیک "الہام" ہے۔
[البقرة: 31-33]؛ [الأعراف: 180 [النجم: 19-23]؛ [الروم: 22]؛ [النحل: 116]؛ [النمل: 16]؛ [الرحمن: 1-4]

[77] [إبراهيم: 4]

واضح رہے کہ "اصطلاح"، وضع کے تابع ہے۔ تاریخی اعتبار سے زبانیں دو قسم کی ہیں: "مرتقیہ" (progressive) اور "غیر مرتقیہ" (non progressive)۔ "غیر مرتقیہ" وہ زبانیں ہیں جو "اشتقاق" اور "تصریف" کو قبول نہیں کرتی ہیں۔ ان زبانوں کی بنیاد "حامیہ" زبان ہے جو حام بن نوح علیہ السلام کی طرف منسوب ہے۔ یہ زبان قدیم مصری، قدیم حبشی اور بربری زبانوں کو شامل ہے۔ علاوہ ازیں "چینی" زبان بھی دوسری قسم ہی میں شمار کی جاتی ہے۔
پہلی قسم پھر "متصرفہ" اور "غیر متصرفہ" میں تقسیم ہے۔ "غیر متصرفہ" وہ زبانیں ہیں جنہیں "طورانی" کہا جاتا ہے اور ان میں ترکی اور منگول زبان وغیرہ شامل ہے۔ یہ وہ زبانیں ہیں جو اصل کلمہ میں الحاق کے رستے "تصریف" قبول کرتی ہیں۔ اور "متصرفہ" کی دو قسمیں ہیں: "یافثیہ" اور "سامیہ"۔ پہلی یافث بن نوح علیہ السلام اور دوسری سام بن نوح علیہ السلام کی طرف منسوب ہے۔ "یافثیہ" کو "آریہ" زبانیں بھی کہتے ہیں اور یہ "شمالی آریائی" اور "جنوبی آریائی" زبانوں میں تقسیم ہے۔ جنوبی زبانیں ہیں جو جنوبی ایشیا میں پھلی پھولیں جیسا کہ سنسکرت، ہندی، افغانی، فارسی، کردی وغیرہ جبکہ شمالی زبانیں وہ ہیں جو یورپ میں پروان چڑھیں اور یہ کلتی (Celtic)، اطالوی (Italian)، ہیلینی (Hellenic)، سلافی (Slavic) اور جرمانی (Germanic) وغیرہ ہیں۔ پہلی میں جزائر برطانیہ کی زبانیں، دوسری میں لاطینی، فرانسیسی، اطالوی، ہسپانوی اور پرتگالی، تیسری میں قدیم وجدید یونانی، چوتھی میں روسی اور بلغارین جبکہ پانچویں میں انگریزی اور جرمن وغیرہ شامل ہیں۔ [جرجي زيدان، الألفاظ العربية والفلسفة اللغوية، بيروت، 1886ء، ص2-4]

"سامی" زبانوں (semitic languags) کی تین قسمیں ہیں۔ پہلی "آرامی" (Aramaic) کہ جس کی فروعات میں "سریانی" (Syriac Aramic) اور "کلدانی" (Chaldean) شامل ہیں۔ دوسری عبرانی (Hebrew) ہے کہ جس سے فینیقی (Phoenician) وغیرہ نکلی ہیں۔ اور تیسری عربی زبان ہے۔ [ایضاً]

[78] [الأحزاب: 34]؛ [الحاكم، أبو عبد الله محمد بن عبد الله بن محمد النيسابوري المعروف بابن البيع، المستدرك على الصحيحين، دار الكتب العلمية – بيروت، 1990ء، 171/1]

[79] [التوبة: 29]؛ [مسند الإمام أحمد بن حنبل: 429/28]؛ [مسند الإمام أحمد بن حنبل: 410/28-411]

[80] [النحل: 44]

[81] [القيامة: 16-19]

[82] قرآن مجید، اللہ کا کلام اور قراءات منزل من اللہ ہیں۔ قرآن مجید کی سند میں میں قاری اور المقری الفاظ کی شیخ سے تلقی کر کے شاگرد پر ان کی تلاوت کرتا ہے۔

[الأعراف:]12؛ [ص: 75]؛ [الشعراء: 46]؛ [النحل: 43]؛ [الأنبياء: 7]؛ [هود: 41]؛ [الغاشية: 22]؛ [الروم: 54]؛ [مالك بن أنس بن مالك بن عامر الأصبحي المدني، الموطأ، كتاب الْقُرْآنُ، باب مَا جَاءَ فِي الْقُرْآنِ، مؤسسة زايد بن سلطان آل نهيان للأعمال الخيرية والإنسانية - أبو ظبي – الإمارات، الأولى، 1425 هـ - 2004 م، 281/2-282]

[83]قرآن مجید میں اصل لفظ ہے جبکہ سنت میں اصل معنی ہے لہٰذا حدیث کی سند میں محدث اپنے شیخ سے سنت کا تحمل کرتا ہے اور اپنے شاگرد کے سامنے اس کو ادا کرتا ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ اللہ عزوجل کے ہیں جبکہ سنت میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ بھی ہیں جیسا کہ قولی سنت کی مثال ہے اور صحابی کے بھی ہیں جیسا کہ فعلی اور تقریری سنت کی مثالیں ہیں۔

[84][صحيح مسلم، كِتَابُ الْإِيمَانَ، بَابُ قول النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ، 45/1]؛ [صحيح البخاري، كِتَابُ الوُضُوءِ، بَابُ فَضْلِ مَنْ بَاتَ عَلَى الوُضُوءِ، 58/1-59]

[85][التوبة: 100]؛ [الترمذي، محمد بن عيسى بن سورة، سنن الترمذي، شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابي الحلبي – مصر، 1975ء، 26/5]؛ [سنن أبي داود، كِتَاب السُّنَّةِ، بَابُ لُزُومِ السُّنَّةِ، 200/4]؛ [صحيح مسلم، كتاب الْفَضَائِلِ، بَابُ فَضْلِ الصَّحَابَةِ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، 1962/4]؛ [سنن أبي داود، أَبْوَابُ النَّوْمِ، بَابُ مَا يُقَالُ عِنْدَ النَّوْمِ، 311/4]

[86][النساء: 115]؛ [البقرة: 143]

[87][صحيح البخاري، كِتَابُ الِاعْتِصَامِ بِالكِتَابِ وَالسُّنَّةِ، بَابُ مَنْ شَبَّهَ أَصْلًا مَعْلُومًا بِأَصْلٍ مُبَيَّنٍ، قَدْ بَيَّنَ اللَّهُ حُكْمَهُمَا، لِيُفْهِمَ السَّائِلَ، 102/9]؛ [صحيح البخاري، كِتَابُ الِاعْتِصَامِ بِالكِتَابِ وَالسُّنَّةِ، بَابُ مَنْ شَبَّهَ أَصْلًا مَعْلُومًا بِأَصْلٍ مُبَيَّنٍ، قَدْ بَيَّنَ اللَّهُ حُكْمَهُمَا، لِيُفْهِمَ السَّائِلَ، 101/9]

قواعد عامہ اور ادلہ اجمالیہ میں سے شرائع من قبلنا اور قول صحابی کا تعلق "شریعت" سے ہے جبکہ استصلاح، سد الذرائع، عرف، استحسان "منہاج" کے اصول ہیں۔

[88][صحيح البخاري، كِتَابُ الصَّوْمِ، بَابُ قَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى: {وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الخَيْطُ الأَبْيَضُ مِنَ الخَيْطِ الأَسْوَدِ مِنَ الفَجْرِ}، 28/3]

[89][آل عمران: 7]

[90][النساء: 11]؛ [البقرة: 228]؛ [صحيح البخاري، كِتَابُ المَغَازِي، بَابُ مَرْجِعِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الأَحْزَابِ، 112/5]؛ [صحيح البخاري، كِتَابُ الصَّوْمِ، بَابُ قَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الخَيْطُ، 28/3]؛ [سنن أبي داود، كِتَاب الطَّهَارَةِ، بَابٌ فِي الْمُتَيَمِّمِ يَجِدُ الْمَاءَ بَعْدَ مَا يُصَلِّ فِي الْوَقْتِ، 93/1]

لفظ کسی معنی کے لیے وضع ہونے کے اعتبار سے خاص، عام اور مشترک میں تقسیم ہوتا ہے۔ اب اس لفظ کا اپنے اس وضعی معنی میں استعمال ہوا ہے یا نہیں، اس پہلو سے حقیقت و مجاز اور صریح و کنایہ میں منقسم ہوتا ہے۔ اور لفظ کی اپنے

وضعی یا غیر وضعی معنی میں دلالت کس قدر ظاہر ہے یا خفی، اس اعتبار سے ظہور کے چار درجات ظاہر، نص، مفسر اور محکم اور خفاء کے چار درجات خفی، مشکل، مجمل اور متشابہہ ہیں۔ اور لفظ کی اپنے معنی پر دلالت کی صورت کیا ہے تو اس اعتبار سے اس کی چار قسمیں ہیں: عبارت نص، دلالت نص، اشارہ نص، اقتضائے نص۔

اس کی ایک دوسری تقسیم یہ ہے کہ لفظ اپنے معنی پر دلالت کے اعتبار سے منطوق اور مفہوم میں تقسیم ہوتا ہے۔ اور منطوق کی دلالت صریح ہوتی ہے یا غیر صریح۔ صریح کی دلالت مطابقت اور تضمن جبکہ غیر صریح کی اشارہ نص، اقتضائے نص اور ایمائے نص میں تقسیم ہوتی ہے۔ اور مفہوم کی تقسیم موافق اور مخالف میں ہوتی ہے۔

[91] [النحل: 44]؛ [النساء: 105]

[92] [صحيح البخاري، كِتَابُ الِاعْتِصَامِ بِالكِتَابِ وَالسُّنَّةِ، 91/9]

[93] مزید تفصیل کے لیے حافظ عبداللہ محدث روپڑی رحمہ اللہ کی کتاب "درایت تفسیر" ملاحظہ فرمائیں۔

[94] [سنن أبي داود، كِتَاب السُّنَّةِ، بَابُ لُزُومِ السُّنَّةِ، المكتبة العصرية، صيدا – بيروت، 200/4]؛ [صحيح مسلم، كتاب الْفَضَائِلِ، بَابُ فَضْلِ الصَّحَابَةِ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، 1962/4]

[95] [الموطأ: 1261/5-1262]

[96] [عمر سليمان الأشقر، الدكتور، تاريخ الفقه الإسلامي، دار النفائس، الأردن، 1991ء، 84-87]

[97] [الشهرستاني، أبو الفتح محمد بن عبد الكريم بن أبي بكر أحمد، الملل والنحل، مؤسسة الحلبي، 11/2-12]

[98] [الأحقاف: 4]

[99] [سنن أبي داود، كِتَاب السُّنَّةِ، بَابُ لُزُومِ السُّنَّةِ، 202/4]

بدعت کی مثال بھی کٹی پتنگ کی سی ہے کہ جس کی سند نہیں ہوتی اور کٹی پتنگ سے تشبیہ اس لیے دی ہے کہ اس کا مقدر زوال ہی ہوتا ہے یعنی وہ نیچے ہی آتی ہے، اوپر نہیں جاتی۔ علاوہ ازیں کٹی پتنگ ہوا کے رحم وکرم پر ہوتی ہے، وہ جس طرف چاہے اسے لے جائے۔ اگر ہوا تیز ہو گی تو شاید اسے بہت اونچا بھی اڑا لے جائے لیکن یہ اونچی اڑان عارضی ہو گی۔

اثری اور حنفی ہر دو روایتیں ہر دور میں بلاشبہ بیسیوں نہیں سینکڑوں اسناد سے ثابت ہوتی رہی ہیں۔ اثری روایت کی ایک معاصر سند اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک یوں ہے: الدكتور الحافظ عبد الرحمن المدنى عن الشيخ عبد العزيز بن باز عن العلامة المحدث الشيخ عبد الحق الهاشمي عن الشيخ أحمد بن عبد الله بن سالم البغدادي عن الشيخ عبد الرحمن بن حسن بن محمد بن عبد الوهاب عن جده شيخ الإسلام محمد بن عبد الوهاب عن الشيخ عبد الله بن إبراهيم المدني عن الشيخ الفقيه عبد القادر التغلبي عن الشيخ المحدث عبد الباقي عن الشيخ المحدث أحمد بن مفلح الوفائي عن الشيخ الفقيه موسى بن أحمد الحجاوي عن الشيخ الفقيه أحمد بن محمد المقدسي المعروف بالشويكي عن الشيخ أحمد بن عبد الله العسكري عن الشيخ علاء الدين المرداوي عن الشيخ إبراهيم بن قندس البعلي عن الشيخ علاء الدين علي بن العباس المعروف بابن اللحام عن الشيخ الحافظ عبد الرحمن بن رجب عن الحافظ شمس الدين ابن القيم عن شيخ الإسلام الحافظ تقي الدين ابن تيمية

عن الفخر ابن البخاري عن ابن قدامة المقدسي صاحب المغني عن عبد القادر الكيلاني صاحب الغنية وأبي الفرج بن الجوزي كلاهما عن أبي الوفاء عن ابن عقيل الحنبلي وأبي الخطاب الكلوذاني عن أبي يعلى الفراء عن ابن حامد الحنبلي عن أبي بكر البغوي المشهور بغلام الخلال عن شيخ الحنابلة أبي بكر الخلال عن أبي بكر المروذي عن إمام السنة أحمد بن حنبل الشيباني عن الإمام محمد بن إدريس الشافعي عن الإمام مالك بن أنس عن نافع مولى ابن عمر عن عبد الله بن عمر عن رسول الله صلي الله عليه وسلم۔

[100] اجتہاد نہ تو کتاب وسنت پر اضافے کا نام ہے اور نہ ہی تبدیلی احکام کا بلکہ اس سے مراد "کسی پیش آمدہ مسئلے میں، اہل علم کا، کتاب وسنت کی وسعتوں اور گہرائیوں میں، اللہ کے حکم، کو تلاش کرنے کی انتہائی جدوجہد، کرنا ہے۔" مزید تفصیل کے لیے پی ایچ ڈی مقالہ "عصر حاضر میں اجتماعی اجتہاد: ایک تجزیاتی مطالعہ" کا پہلا باب "اجتہاد کا تعارف" ملاحظہ فرمائیں۔

[101] اس کے لیے اہل علم کی ایک جماعت نے "تقلید" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ "اتباع" اور "تقلید" میں فرق یہ کیا جاتا ہے کہ "اتباع" میں عامی، اللہ کے حکم کے ساتھ، عالم دین سے دلیل بھی پوچھتا ہے، چاہے دلیل اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے جبکہ "تقلید" میں صرف اللہ کا حکم معلوم کیا جاتا ہے اور اس کی دلیل نہیں مانگی جاتی۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں عامی کا ذہن یہ بن جاتا ہے کہ اس نے اللہ کے حکم کی اتباع کی ہے اور عالم دین ایک ذریعہ ہے جبکہ دوسری صورت میں عامی کا ذہن سمجھتا تو یہی ہے کہ اس نے اللہ کے حکم کی اتباع کی ہے لیکن عالم دین اس کے لیے محض دین کا ذریعہ نہیں رہتا بلکہ خود مصدر بن جاتا ہے۔ ہماری نظر میں تقلید کی نسبت اتباع کی اصطلاح قابل ترجیح ہے۔ امام ابن عبد البر 463ھ نے اپنی کتاب ''جامع بيان العلم وفضله'' میں ''الْفَرَقِ بَيْنِ التَّقْلِيدِ وَالِاتِّبَاعِ'' کے نام سے باب باندھا ہے۔ [ابن عبد البر، أبو عمر يوسف بن عبد الله بن محمد بن عاصم القرطبي، جامع بيان العلم وفضله، دار ابن الجوزي، المملكة العربية السعودية، الأولى، 1414 هـ - 1994 م، 2/787-788]

اور "تقلید" ان اصولی مسائل میں حرام ہے کہ جو قطعی ہیں جیسا کہ توحید وشرک کے مسائل ہیں۔ اگر کوئی مقلد کسی عالم دین کی تقلید کرتے ہوئے کفر، شرک یا بدعت کا ارتکاب کرے گا تو یہ اس کے لیے آخرت میں ہر گز عذر نہ بنے گا۔ [التوبة: 31]؛ [سنن الترمذي، أَبْوَابُ تَفْسِيرِ الْقُرْآنِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، بَابٌ: وَمِنْ سُورَةِ التَّوْبَةِ، 5/278]

البتہ فروعی مسائل میں "تقلید" اس کے لیے جائز ہے جو "اجتہاد" کا اہل نہ ہو۔ [ابن تيمية، تقي الدين أبو العباس أحمد بن عبد الحليم الحراني، مجموع الفتاوى، مجمع الملك فهد لطباعة المصحف الشريف، المدينة النبوية، المملكة العربية السعودية، 1416هـ/1995م، 20/203-204]

اور "تقلید" اور "تقلید شخصی" میں بھی فرق ہے۔ "تقلید شخصی" یعنی کسی متعین عالم دین کی تقلید کے "وجوب" کی کوئی دلیل ہمارے دین میں موجود نہیں ہے بلکہ اس کے قائلین بھی اسے ایک انتظامی مسئلہ قرار دیتے ہیں۔

[102] [النحل: 43]

[103] [مريم: 43]؛ [الأنعام: 75-83]

[104] [الزمر: 64]؛ [الأعراف: 138]

[105] [النحل: 36]

[106] [النساء: 165]

[107] [الحديد: 25]

[108] [الحديد: 21]؛ [البقرة: 249]؛ [البقرة: 251]؛ [الأنفال: 66]

[109] [الجمعة: 2-3]

[110] [التوبة: 33]

[111] [سنن الترمذي، أَبْوَابُ الْعِلْمِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، بَابُ مَا جَاءَ فِي فَضْلِ الفِقْهِ عَلَى العِبَادَةِ، 48/5]

[112] [ابن أبي شيبة، أبو بكر عبد الله بن محمد بن إبراهيم بن عثمان بن خواستي العبسي، الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار، مكتبة الرشد – الرياض الأولى، 1409هـ، 432/7]

[113] [صحيح البخاري، كِتَابُ الِاعْتِصَامِ بِالكِتَابِ وَالسُّنَّةِ، بَابُ أَجْرِ الحَاكِمِ إِذَا اجْتَهَدَ فَأَصَابَ أَوْ أَخْطَأَ، 108/9]؛ [ابن ماجة أبو عبد الله محمد بن يزيد القزويني، سنن ابن ماجه، كِتَابُ الْأَحْكَامِ، بَابُ الْحَاكِمِ يَجْتَهِدُ فَيُصِيبُ الْحَقَّ، دار إحياء الكتب العربية - فيصل عيسى البابي الحلبي، 776/2]؛ [سنن الترمذي، أَبْوَابُ الْأَحْكَامِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، بَابُ مَا جَاءَ فِي القَاضِي كَيْفَ يَقْضِي، 608/3]؛ [صحيح البخاري، كِتَابُ فَرْضِ الخُمُسِ، بَابُ قَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى: {فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ}، 85/4]

[114] [الأنفال: 39]

[115] [مسند الإمام أحمد بن حنبل: 467/35]

[116] [سنن ابن ماجه، كِتَابُ إِقَامَةِ الصَّلَاةِ، وَالسُّنَّةُ فِيهَا بَابُ مَا جَاءَ فِي صَلَاةِ الْعِيدَيْنِ، 406/1]

[117] **اللہ نے اپنے دین کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے نہ کہ صرف قرآن مجید کا، اور دین میں کتاب وسنت دونوں شامل ہیں۔ ایک لفظ اور دوسرا معنی ہے اور دونوں وحی ہیں۔ یہ کہنا کہ اللہ نے لفظ کی حفاظت کا ذمہ ہے لیا ہے جبکہ معنی کا نہیں، ایک غیر منطقی دعوی ہے۔** [الحجر: 9]؛ [ابن حزم، أبو محمد علي بن أحمد بن سعيد الأندلسي الظاهري، الإحكام في أصول الأحكام، دار الآفاق الجديدة، بيروت، 98/1]؛ [ابن تيمية، تقي الدين أبو العباس أحمد بن عبد الحليم الحنبلي الدمشقي، الجواب الصحيح لمن بدل دين المسيح، دار العاصمة، السعودية، الثانية، 1419هـ / 1999م، 38/3-39]

[118] [صحيح البخاري، كِتَابُ الجِهَادِ وَالسِّيَرِ، بَابُ يُقَاتَلُ مِنْ وَرَاءِ الإِمَامِ وَيُتَّقَى بِهِ، 50/4]

[119] [آل عمران: 110]؛ [التوبة: 111]؛ [صحيح مسلم، كِتَابُ الْإِيمَانَ، بَابُ نُزُولِ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ حَاكِمًا بِشَرِيعَةِ نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، 137/1]

[120] [الغاشية: 21-22]؛ [ق: 45]؛ [الرعد: 40]

[121][التوبة: 71]؛ [سنن ابن ماجه، كِتَابُ إِقَامَةِ الصَّلَاةِ، وَالسُّنَّةُ فِيهَا بَابُ مَا جَاءَ فِي صَلَاةِ الْعِيدَيْنِ، 406/1]

[122][الأنفال: 39]؛ [صحيح البخاري، كِتَابُ الجِهَادِ، وَالسِّيَرِ بَابُ مَنْ قَاتَلَ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ العُلْيَا، 20/4]

[123][التوبة: 157]

[124][التوبة: 71]؛ [سنن ابن ماجه، كِتَابُ إِقَامَةِ الصَّلَاةِ، وَالسُّنَّةُ فِيهَا بَابُ مَا جَاءَ فِي صَلَاةِ الْعِيدَيْنِ، 406/1]

[125][صحيح البخاري، كِتَابُ الحَجِّ، بَابُ الخُطْبَةِ أَيَّامَ مِنًى، 176/2]

[126][صحيح البخاري، كِتَابُ الْإِمَارَةِ، بَابُ وُجُوبِ طَاعَةِ الْأُمَرَاءِ فِي غَيْرِ مَعْصِيَةٍ، وَتَحْرِيمِهَا فِي الْمَعْصِيَةِ، 1470/3]؛ [صحيح مسلم، كِتَابُ الْإِمَارَةِ، بَابُ الْأَمْرِ بِلُزُومِ الْجَمَاعَةِ عِنْدَ ظُهُورِ الْفِتَنِ، 1475/3]

[127][آل عمران: 105]؛ [آل عمران: 103]؛ [الشورى: 13]؛ [سنن الترمذي، أَبْوَابُ الْإِيمَانِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، مَا جَاءَ فِي افْتِرَاقِ هَذِهِ الْأُمَّةِ، 26/5]؛ [سنن أبي داود، كِتَاب السُّنَّةِ، بَابُ شَرْحِ السُّنَّةِ، 198/4]

[128]اور اس کے مطابق دنیا کی زندگی خالق کے حکم کے مطابق گزارنے کی دعوت اور تلقین کے لیے ہر دور اور ہر قوم میں پیغمبر مبعوث کیے گئے۔ اس طرح اس دنیا میں انسانی زندگی کی ابتداء ہوئی۔ اور زمین پر یہ دجلہ وفرات کے مابین کی سرزمین (Mesopotamia) تھی کہ جہاں پہلی انسانی تہذیب نے جنم لیا اور اس علاقے کو دنیا کی دیگر تہذیبوں کے لیے ایک مہد (cradle of civilization) کی حیثیت حاصل ہوئی۔ تہذیب انسانی کی پیدائش اور ابتداء میں عرصہ دراز تک نبیوں کی سرزمین بھی یہی علاقہ ہی رہا ہے۔ پس نبیوں کی اس سرزمین پر ایک آسمانی جوڑے سے خاندان اور خاندانوں سے معاشرے نے جنم لیا اور انسانوں کی اجتماعیت نے ایک آزاد سیاسی وجود کے طور ریاست کی شناخت حاصل کی۔ اسی طرح گویا کہ ریاست کا ادارہ آدم علیہ السلام کی خلافت ارضی کی نظریاتی بنیاد پر وجود میں آیا اور انسانی معاشرے کو منظّم کرنے کے لیے خلیفہ اول کو اللہ کی سرزمین میں آسمانی قانون جاری وساری کرنے کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔ نظریاتی ریاست سے مراد وہ ریاست ہے جو معاشرے کے اجتماعی اور سیاسی امور میں ایک نظریے کی مکمل مصدریت اور حاکمیت کو تسلیم کرتی ہو۔ انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے ان کے خالق نے انبیاء ورسل اور کتابوں کا سلسلہ جاری فرمایا۔ چونکہ انبیاء ورسل انسان کی دینی ودنیاوی دونوں قسم کی ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے لہٰذا انہیں دونوں قسم کی سعادت وسیادت سے نوازا گیا۔ اس دنیا میں بھیجے جانے والے پہلے انسان نہ صرف پہلے خالق کے پہلے نبی تھے بلکہ پہلے خلیفہ بھی تھے۔ اس زمین پر نبوت اور خلافت اس وقت سے ہے جب سے آدم علیہ السلام ہیں۔ اللہ عزوجل نے آدم علیہ السلام کو اس زمین پر پہلا انسان، پہلا نبی اور پہلا خلیفہ بنا کر بھیجا۔

[129][یونس: 19]

[130][المائدة: 27-29]

[131][البقرة: 38-39]

[132] پہلی انسانی تہذیب کے اتارے گئے آسمانی قانون میں قتل کو ایک جرم قرار دیا گیا تھا اور آدم علیہ السلام کے ایک بیٹے نے اپنے بھائی کو ناحق قتل کر کے اس دنیا میں خدا کے قانون سے بغاوت اور سرکشی کی رسم کو جاری کیا۔ [صحيح البخاري، كِتَابُ أَحَادِيثِ الأَنْبِيَاءِ، بَابُ خَلْقِ آدَمَ صَلَوَاتُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَذُرِّيَّتِهِ، 133/4]

[133] [البقرة: 213]

[134] [جامع البيان في تأويل القرآن: 6/30]؛ [البغوي، أبو محمد الحسين بن مسعود، معالم التنزيل في تفسير القرآن = تفسير البغوي، دار طيبة للنشر والتوزيع، الرابعة، 1417 هـ - 1997 م، 79/1]؛ [القرطبي، أبو عبد الله محمد بن أحمد بن أبي بكر بن فرح الأنصاري الخزرجي شمس الدين، الجامع لأحكام القرآن = تفسير القرطبي، دار الكتب المصرية – القاهرة، 1384هـ - 1964 م، 263/1]

[135] [ص: 26]

آدم علیہ السلام کو زمین کی جو خلافت عطا کی گئی تو اس کا مقصد اللہ کے حکم کو اللہ کی سرزمین میں نافذ کرنا تھا۔ پس آدم علیہ السلام اسی معنی میں خلیفہ تھے کہ جس معنی میں حضرت داؤد علیہ السلام کو خلیفہ بنایا گیا۔ [المراغي، أحمد بن مصطفى، تفسير المراغي، شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابى الحلبي وأولاده بمصر، الأولى، 1365 هـ - 1946 م، 80/1]

[136] [صحيح البخاري: 169/4]

[137] [ابن أبي شيبة، أبو بكر عبد الله بن محمد بن إبراهيم بن عثمان، الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار، مكتبة الرشد – الرياض الأولى، 1409، 432/7]

[138] [ابن سعد، أبو عبد الله محمد بن سعد بن منيع الهاشمي بالولاء (المتوفى: 230هـ)، الطبقات الكبرى دار الكتب العلمية – بيروت الأولى، 1410 هـ - 1990 م، 213/3؛ عمر بن شبة (واسمه زيد) بن عبيدة بن ريطة النميري البصري، أبو زيد (المتوفى: 262هـ) ، تاريخ المدينة لابن شبة، السيد حبيب محمود أحمد – جدة، 1399 هـ، 678/2]

[139] [مسند الإمام أحمد بن حنبل: 248/36]

[140] [صحيح مسلم: 1453/3]

[141] بنو عباس کے مد مقابل دو خلافتوں کا اعلان ہوا۔ ایک تو 909ء میں مصر کے فاطمی شیعہ نے یہ دعوی کیا کہ جنہیں صلاح الدین ایوبی نے 1171ء میں مٹا دیا اور دوسرے مدعی خلافت اندلس کے "عبد الرحمٰن الثالث" تھے کہ جنہوں نے 928ء میں خلیفہ کا لقب اختیار کیا۔ اندلس کے استثناء کے علاوہ بنو عباس کے دور میں جتنی بھی مقامی مسلمان حکومتیں قائم ہوئیں، ان کے حکمرانوں نے خلیفہ سے خطابات یا اعزازات لینے کو ہی اپنے لیے شرف سمجھا جیسا کہ محمود غزنوی نے "یمین الدولۃ" اور "امین الملۃ" جبکہ یوسف بن تاشفین نے "امیر المسلمین" اور "سلطان" اور فرمانروائے ہند التمش نے بھی "سلطان" کا خطاب حاصل کیا۔ صلاح الدین ایوبی کو بھی خلیفہ کی طرف سے اسی قسم کی سند اختیار جاری کی گئی تھی۔ بنو عباس کے زوال کے بعد ان کا آخری خلیفہ المتوکل سوم 1517ء میں عثمانی ترک سلطان "سلیم اول" کے

حق میں خلافت سے دستبردار ہو گیا تھا۔[خلافت، اردو دائرۃ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور، 1973ء، 594-596/8]

[142] [مسند الإمام أحمد بن حنبل: 153/15-154]

[143] [آل عمران: 110]؛ [الأنفال: 39]؛ [التوبة: 29]

[144] [النساء: 165]

[145] [البينة: 1-2]

[146] [صحيح مسلم، كِتَابِ الطَّهَارَةِ، بَابُ فَضْلِ الْوُضُوءِ، 203/1]

[147] [التوبة: 29]

اس آیت مبارکہ میں دو اصناف کا بیان ہے۔ پہلی قسم ان مشرکین کی ہے جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اسے حرام قرار نہیں دیتے جسے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام قرار دیا ہو جیسا کہ سورۃ یونس [59]، سورۃ النحل [116] اور سورۃ الانعام [136-140] وغیرہ میں تفصیلات موجود ہیں۔ اور دوسری قسم ان اہل کتاب کی ہے جو دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔ ان دونوں سے جہاد و قتال کی غایت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔ اس آیت مبارکہ سے ماقبل آیات میں شروع سورہ توبہ ہی سے مشرکین کا بیان چلا رہا ہے اور متصل قبل آیت مبارکہ 27 میں [يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ...] کے بیان میں بھی مشرکین عرب ہی سے خطاب ہے۔ پس آیت مبارکہ 28 میں آغاز آیت [قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ...] میں جو قتال کا حکم دیا گیا تو اس میں بھی مشرکین عرب ہی مخاطب ہیں۔ اور ان کے بیان کے ذیل میں اہل کتاب کا بھی حکم بیان کر دیا گیا۔ تو ایک پہلو تو نظم قرآن کا ہوا جو اس بات کا متقاضی ہے کہ اس آیت مبارکہ میں دو اصناف کا مراد لینا زیادہ بہتر ہے اور دوسرا خود آیت مبارکہ کے الفاظ [قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ...] یہ واضح کرتے ہیں کہ ان سے مراد مشرکین عرب ہیں کیونکہ قرآن مجید نے اہل کتاب کا تعارف ایک ایسے گروہ کے طور نہیں کروایا جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہ رکھتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جن مفسرین نے اس آیت مبارکہ میں جو حکم قتال بیان ہوا ہے، اسے ایک ہی صنف اہل کتاب سے متعلق کیا ہے تو انہیں یہ ثابت کرنے کے لیے تاویل کرنی پڑی کہ اہل کتاب کسی طرح اللہ کو بھی نہیں مانتے اور آخرت پر بھی ان کا ایمان نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک کسی تاویل کی ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ اس آیت مبارکہ میں دو اصناف کا ذکر ہے۔

[148] [صحيح مسلم: 1357/3]؛ [عبد الرزاق بن همام بن نافع الحميري اليماني الصنعاني، أبو بكر، المصنف، المكتب الإسلامي – بيروت، الثانية، 1403، 69/6]

[149] [سنن أبي داود: 184/4]۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ اس حدیث کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ اس امت میں ہر ہر لمحے قتال ہوتا رہے گا۔ اس حدیث کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ جہاد کی اجازت قیامت تک باقی رہے گی اور اسے کوئی منسوخ نہیں کر سکتا۔ اور جہاد یہاں وسیع معنی میں ہے کہ جس میں غلبہ دین کے لیے کی جانے والی ہر کوشش شامل ہے حتی کہ

قتال بھی۔ "منذ بعثنی" کے الفاظ بتلا رہے ہیں کہ یہاں جہاد سے مراد محض قتال نہیں ہے جبکہ "یقاتل" کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں کہ یہاں جہاد میں قتال بھی شامل ہے۔ ایک اور روایت کے الفاظ ہیں: «إِذَا تَبَايَعْتُمْ بِالْعِينَةِ، وَأَخَذْتُمْ أَذْنَابَ الْبَقَرِ، وَرَضِيتُمْ بِالزَّرْعِ، وَتَرَكْتُمُ الْجِهَادَ، سَلَّطَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ ذُلًّا لَا يَنْزِعُهُ حَتَّى تَرْجِعُوا إِلَى دِينِكُمْ» [سنن أبي داود: 274/3-275] ایک اور روایت کے الفاظ ہیں: الخَيْلُ مَعْقُودٌ فِي نَوَاصِيهَا الخَيْرُ إِلَى يَوْمِ القِيَامَةِ: الأَجْرُ وَالمَغْنَمُ [صحيح بخاري: 28/4] اس معنی کی تمام روایات قرآن مجید کی آیت مبارکہ [وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ [الأنفال: 39] ہی کا ہی بیان ہیں۔

[150] [صحيح مسلم: 135/1]

[151] علت کے اوصاف میں اصل اور بنیادی ترین وصف مناسبت اور ملائمت کا ہے جبکہ انضباط تو انتقال علت یا قیاس کے لیے مطلوب ہے۔

[152] [الحج: 39]۔ اس آیت مبارکہ میں "باء" تعلیل کے لیے ہے۔ پس "ظلم وعدوان" جہاد وقتال کی وہ منصوص حکمت ہے کہ جسے کتاب وسنت نے ظلم کی متعین صورتوں کے بیان کے ساتھ علت بنا دیا ہے۔

[153] [الحجرات: 9]؛ [صحيح البخاري، كِتَابُ الإِيمَانِ، بَابُ {وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ المُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا}، 15/1]

[154] اس بارے ملاحظہ ہو سہ ماہی "نظریات" میں شائع شدہ تحقیقی مضمون "قانون اتمام حجت اور قانون جہاد: ایک تجزیاتی مطالعہ"

[155] یہی وجہ ہے کہ حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کا رستم کے دربار میں جو طویل مکالمہ ہوا اور اس میں رستم کے سوال پوچھنے پر کہ تم عرب ہم سے کیوں لڑنے آئے ہو؟ یہ جواب دیا: اللَّهُ ابْتَعَثَنَا، وَاللَّهُ جَاءَ بِنَا لِنُخْرِجَ مَنْ شَاءَ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبَادِ إِلَى عِبَادَةِ اللَّهِ، وَمِنْ ضِيقِ الدُّنْيَا إِلَى سِعَتِهَا، وَمِنْ جَوْرِ الأَدْيَانِ إِلَى عَدْلِ الإِسْلامِ [الطبري، أبو جعفر محمد بن جرير بن يزيد بن كثير بن غالب الآملي، تاريخ الطبري = تاريخ الرسل والملوك، دار التراث – بيروت، الثانية – 1387 هـ، 520/3]

[156] پہلی ذمہ داری کی دلیل قرآن مجید کی آیت [وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿آل عمران: 104﴾] ہے جبکہ دوسری ذمہ داری کی دلیل آیت مبارکہ [قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ ﴿التوبة: 29﴾] ہے۔ دوسری ذمہ داری کی ادائیگی میں البتہ یہ ضرور ملحوظ رکھا جائے گا کہ مسلمان ریاست کے پاس مشرک اور غیر مسلم اقوام کو مفتوح اور مغلوب کرنے کی استطاعت اور صلاحیت موجود ہے۔ اگر کسی مسلمان ریاست کے پاس یہ استطاعت اور صلاحیت نہ ہو گی تو اس کے لیے اس غرض سے جہاد وقتال بھی درست نہیں قرار پائے گا اور اس صورت میں وہ دوسری اقوام کے حوالے سے صرف دعوت وتبلیغ کی ذمہ داری ادا کرنے پر اکتفا کریں گے۔ باقی رہی اسلامی ریاست کی داخلی ذمہ داریاں تو وہ اس تحریر کا

موضوع نہیں ہے۔

[157][الروم: 30]؛ [صحيح البخاري، كِتَابُ الجَنَائِزِ، بَابُ إِذَا أَسْلَمَ الصَّبِيُّ فَمَاتَ، هَلْ يُصَلَّى عَلَيْهِ، وَهَلْ يُعْرَضُ عَلَى الصَّبِيِّ الإِسْلاَمُ، 94/2-95]

[158][التغابن: 2]

[159][النحل: 76]؛ [غافر: 58]؛ [القلم: 35]

[160][البينة: 6-7]

[161][البقرة: 190]؛ [النساء: 75]

[162][التوبة: 29]

[163][التوبة: 6]

[164][النساء: 91]؛ [الانفال: 61]

[165][الممتحنة: 4]؛ [المائدة: 51-52]؛ [التوبة: 23]

[166][آل عمران: 28]

[167][الممتحنة: 8]

[168][الممتحنة: 8]

[169][المائدة: 5]

[170][التوبة: 29]؛ [مسند الإمام أحمد بن حنبل: 587/11]؛ [المصنف لعبد الرزاق، كِتَابُ أَهْلِ الْكِتَابِ، باب هَدْمُ كَنَائِسِهِمْ، وَهَلْ يَضْرِبُوا بِنَاقُوسٍ؟، المكتب الإسلامي – بيروت، الثانية، 1403هـ، 85/6]؛ [المصنف لعبد الرزاق، كِتَابُ أَهْلِ الْكِتَابِ، باب هَدْمُ كَنَائِسِهِمْ، وَهَلْ يَضْرِبُوا بِنَاقُوسٍ؟، 61/6]؛ [المصنف لعبد الرزاق، كِتَابُ أَهْلِ الْكِتَابِ، باب دِيَةُ الْمَجُوسِيِّ، 126/6]؛ [صالح بن عبد العزيز آل الشيخ، التكميل لما فات تخريجه من إرواء الغليل مع إرواء الغليل في تخريج أحاديث منار السبيل، المكتب الإسلامي – بيروت، الثانية 1405 هـ - 1985م، 105/5]؛ [الخَلَّال، أبو بكر أحمد بن محمد بن هارون بن يزيد البغدادي الحنبلي (المتوفى: 311هـ)، أحكام أهل الملل والردة من الجامع لمسائل الإمام أحمد بن حنبل، دار الكتب العلمية، بيروت – لبنان، الأولى، 1414 هـ - 1994 م، 357-359]؛ [عبد الله بن أحمد بن ربيعة بن زبر الربعي، أبو محمد (المتوفى: 329هـ)، جزءٌ فيه شروط النصارى، دار البشائر الإسلامي، الأولى 1427 هـ - 2006 م، 25]؛ [جزءٌ فيه شروط النصارى: 21-22]؛ [جزءٌ فيه شروط النصارى: 25]؛ [جزءٌ فيه شروط النصارى: 31]؛ [جزءٌ فيه شروط النصارى: 28]؛ [ابن تيمية، تقي الدين أبو العباس أحمد بن عبد الحليم الحنبلي (المتوفى: 728هـ)، اقتضاء الصراط المستقيم لمخالفة أصحاب الجحيم، دار عالم الكتب، بيروت، لبنان السابعة، 1419هـ - 1999م، 365-369]

[171][صحيح البخاري، كِتَابُ الإِيمَانِ، بَابُ سُؤَالِ جِبْرِيلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الإِيمَانِ، وَالإِسْلاَمِ، وَالإِحْسَانِ، 19/1]

[172][صحيح البخاري، كِتَابُ المَنَاقِبِ، بَابُ قِصَّةِ زَمْزَمَ، 184/4]؛ [مسند الإمام أحمد بن حنبل: 94/5]

[173][النساء: 150-151]؛ [التوبة: 64-66]؛ [البقرة: 217]؛ [آل عمران: 100]؛ [المائدة: 44]؛ [النمل: 43]؛ [العنكبوت: 47]؛ [الزمر: 59]؛ [الأنعام: 121]؛ [يوسف: 106]

[174][صحيح البخاري، كِتَابُ الأَدَبِ، بَابُ مَنْ كَفَّرَ أَخَاهُ بِغَيْرِ تَأْوِيلٍ فَهُوَ كَمَا قَالَ، 26/8]

[175][صحيح البخاري، كِتَابُ الشَّهَادَاتِ، بَابُ تَعْدِيلِ كَمْ يَجُوزُ؟، 169/3]

[176][الألباني، أبو عبد الرحمن محمد ناصر الدين، سلسلة الأحاديث الصحيحة وشيء من فقهها وفوائدها، مكتبة المعارف للنشر والتوزيع، الرياض، 1416 هـ - 1996 م، 113/6-114]؛ [ابن أبي العز الحنفي، صدر الدين محمد بن علاء الدين عليّ بن محمد، شرح العقيدة الطحاوية، وزارة الشؤون الإسلامية، والأوقاف والدعوة والإرشاد، الرياض، الأولى - 1418 هـ، 303-305]

[177][يوسف: 106]؛ [الحجرات: 9]؛ [صحيح البخاري، كِتَابُ الفِتَنِ، بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لاَ تَرْجِعُوا بَعْدِي كُفَّارًا، يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ»، 50/9]؛ [سنن الترمذي، أَبْوَابُ الطَّهَارَةِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي كَرَاهِيَةِ إِتْيَانِ الحَائِضِ، 242/1]؛ [سنن الترمذي، أَبْوَابُ الْإِيمَانِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي تَرْكِ الصَّلَاةِ، 13/5]؛ [صحيح البخاري، كِتَابُ الإِيمَانِ، بَابُ خَوْفِ المُؤْمِنِ مِنْ أَنْ يَحْبَطَ عَمَلُهُ وَهُوَ لاَ يَشْعُرُ، 19/1]؛ [صحيح البخاري، كِتَابُ الحُدُودِ، بَابُ إِثْمِ الزُّنَاةِ، 164/8]

[178][صحيح البخاري، كِتَابُ الإِيمَانِ، بَابُ عَلاَمَةِ المُنَافِقِ، 16/1]

[179][فاطر: 32-35]؛ [سنن الترمذي، أَبْوَابُ تَفْسِيرِ الْقُرْآنِ، وَمِنْ سُورَةِ المَلَائِكَةِ، 363/5]؛ [صحيح البخاري، كِتَابُ الحُدُودِ، بَابُ مَا يُكْرَهُ مِنْ لَعْنِ شَارِبِ الخَمْرِ، وَإِنَّهُ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنَ المِلَّةِ، 158/8-159]

[180][التوبة: 124]؛ [الفتح: 4]؛ [الأنفال: 2]؛ [المائدة: 93]؛ [سنن أبي داود، كِتَاب الْأَشْرِبَةِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي الْخَمْرِ تُخَلَّلُ، 326/3]

[181][سنن أبي داود، كِتَاب الْأَدَبِ، بَابٌ فِي النَّهْيِ عَنِ البَغْيِ، 275/1-276]

البتہ جن کے جنتی یا جہنمی ہونے کے بارے کوئی نص صریح موجود ہے تو انہیں جنتی یا جہنمی قرار دینا واجب ہے جیسا کہ عشرۂ مبشرۃ جنتی ہیں اور آل فرعون جہنمی ہیں۔ [سنن أبي داود، كِتَاب السُّنَّةِ، بَابٌ فِي الْخُلَفَاءِ، 211/4]؛ [غافر: 45-46]

[182][صحيح مسلم، كِتَابُ الْإِيمَانَ، بَابُ تَحْرِيمِ الْكِبْرِ وَبَيَانِهِ، 93/1]؛ [مسند أحمد: 589/11-590]؛ [صحيح البخاري، كِتَابُ التَّوْحِيدِ، بَابُ كَلاَمِ الرَّبِّ عَزَّ وَجَلَّ يَوْمَ القِيَامَةِ مَعَ الأَنْبِيَاءِ وَغَيْرِهِمْ، 146/9-147]

[183][المائدة: 28-31]

[184][الطور: 30-32]؛ [صحيح مسلم، كِتَابُ الْإِمَارَةِ، بَابُ الْأَمْرِ بِلُزُومِ الْجَمَاعَةِ عِنْدَ ظُهُورِ الْفِتَنِ، 1475/3]

[185][البقرة: 216]

[186] [سنن أبي داود، كِتَاب السُّنَّةِ، بَابُ الدَّلِيلِ عَلَى زِيَادَةِ الْإِيمَانِ وَنُقْصَانِهِ، 220/4]؛ [مسند الإمام أحمد بن حنبل: 431/16]؛ [صحيح مسلم، كتاب الْبِرِّ وَالصِّلَةِ وَالْآدَابِ، بَابٌ فِي فَضْلِ الْحُبِّ فِي اللهِ، 1988/4]؛ [الممتحنة: 4]

[187] [الجاثية: 14]؛ [التوبة: 123]؛ [طه: 43-44]؛ [التوبة: 12-15]؛ [طه: 51-52]؛ [الأنبياء: 52-54]

[188] [صحيح مسلم، كتاب الْبِرِّ وَالصِّلَةِ وَالْآدَابِ، بَابُ تَفْسِيرِ الْبِرِّ وَالْإِثْمِ، 1980/4]؛ [سنن الترمذي، أَبْوَابُ البِرِّ وَالصِّلَةِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي حُسْنِ الخُلُقِ، 362/4]

[189] [مسند الإمام أحمد بن حنبل: 361/29]؛ [صحيح المسلم، كتاب الْفَضَائِلِ، بَابُ مِنْ فَضَائِلِ يُوسُفَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، 1846/4]؛ [الموطأ، كتاب حُسْنُ الْخُلُقِ، باب مَا جَاءَ فِي الْحَيَاءِ، 1331/5]

[190] [مسند الإمام أحمد بن حنبل: 33/20]؛ [صحيح البخاري، كِتَابُ الإِيمَانِ، بَابُ أُمُورِ الإِيمَانِ، 11/1]؛ [مسند الإمام أحمد بن حنبل: 153/14]؛ [صحيح مسلم، كِتَابُ الْإِيمَانَ، بَابُ الْحَثِّ عَلَى إِكْرَامِ الْجَارِ وَالضَّيْفِ، وَلُزُومِ الصَّمْتِ إِلَّا عَنِ الْخَيْرِ وَكَوْنِ ذَلِكَ كُلِّهِ مِنَ الْإِيمَانِ، 68/1]

[191] [سنن الترمذي، أَبْوَابُ الرَّضَاعِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي حَقِّ المَرْأَةِ عَلَى زَوْجِهَا، 458/3]

[192] [البيهقي، أبو بكر أحمد بن الحسين بن علي بن موسى، السنن الكبرى، دار الكتب العلمية، بيروت، الثالثة، 1424 هـ - 2003 م، 323/10]

[193] [الأحزاب: 21]

Quarterly
Apr. - Jun. 2015

HIKMAT-E-QURAN

Lahore
Vol.34 No.2

مرکزی انجمن خُدّامُ القُرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان — اور — سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حِکمت کی

وسیع پیمانے — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک بپا ہو جائے

اور اس طرح

اِسلام کی نشاۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دور ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ